سہ ماہی انٹرنیشنل

پیش رفت
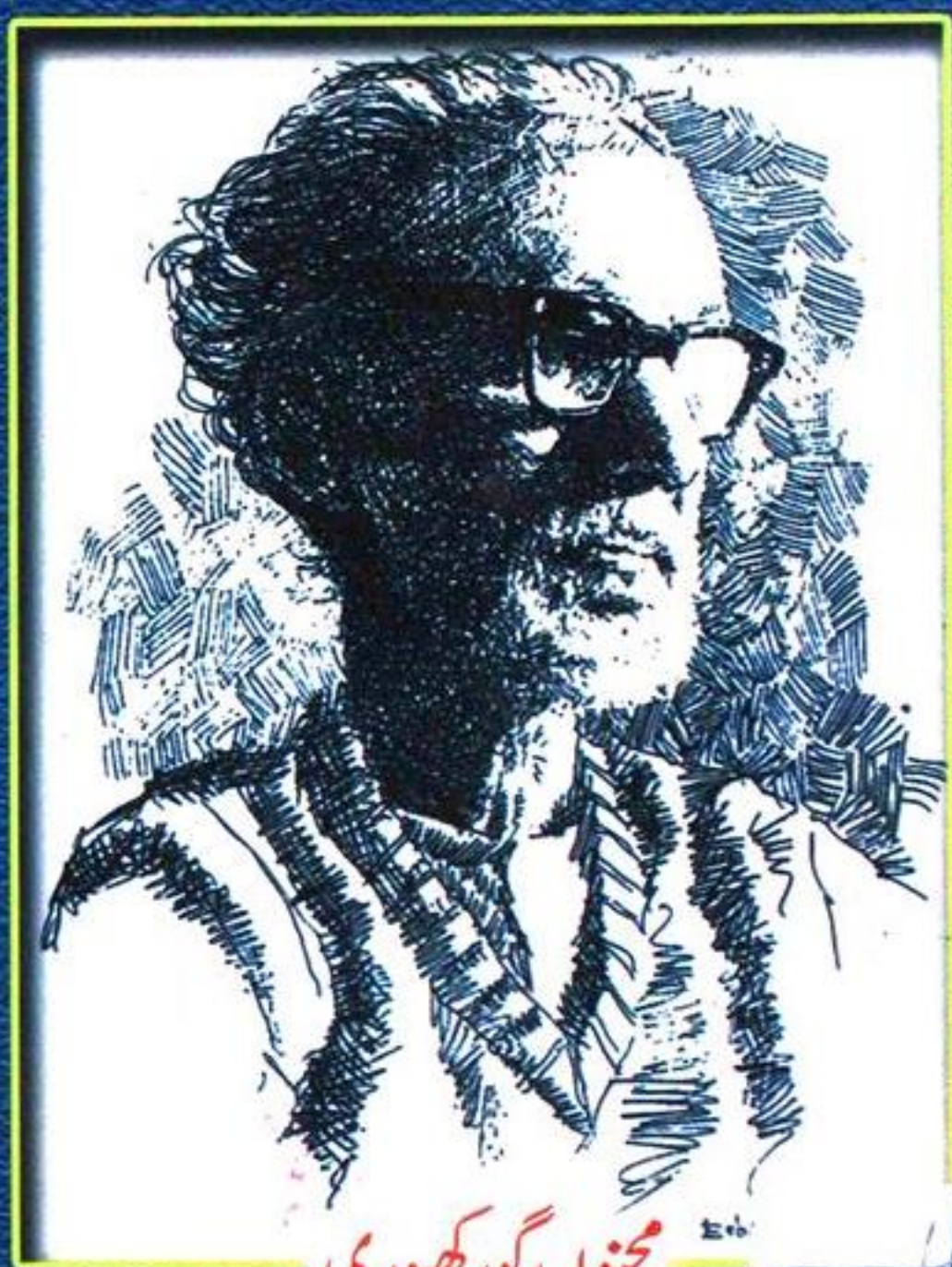
کراچی

مجنوں گورکھپوری

مدیر اعلیٰ (اعزازی)

شفیق احمد شفیق

پہلی صف میں (دائیں سے بائیں) عاصم صدیقی، نجم الہدیٰ، افتخار اجمل شاہین، آفاق صدیقی، ادیب سہیل، شہناز نور احمد زین الدین، پچھلی صف میں (دائیں سے بائیں) جمیل عظیم آبادی، عشرت رومانی، قیصر سلیم، نعمت اللہ، فضا اعظمی، پیرزادہ قاسم، فرمان فتح پوری، ندا علی، حنیف فوق، آغا نور محمد پٹھان، شفیق احمد شفیق۔
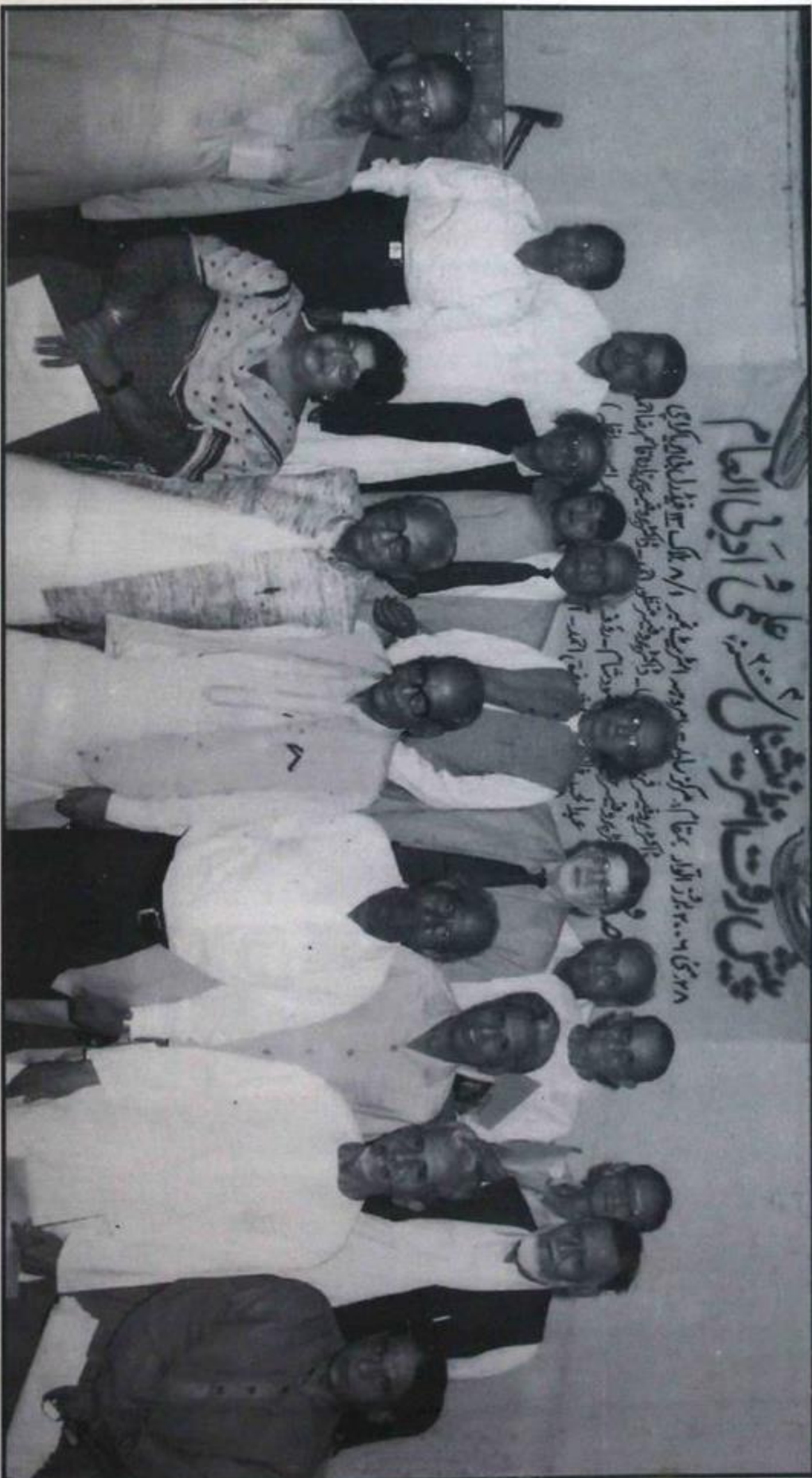
علم وادب کی اعلیٰ اقدار کا نقیب

انٹرنیشنل

پیش رفت

کراچی

کتابی سلسلہ نمبر ۱۴۔۱۳ مئی تا دسمبر ۲۰۰۷

مراسلت کے پتے

ڈی۔ ٹی ۸۷ بلاک ۱۸ سمن آباد،

فیڈرل بی ایریا کراچی

۱۱۸۰ بلاک ۱۸۔ سمن آباد، فیڈرل بی ایریا

پبلیشرز: روشن خیال کتاب کار

مطبع: خرم پریس برنس روڈ کراچی

چار شمارے ۲۴۰ روپے ۱۱۰ امریکی ڈالر	قیمت فی شمارہ ۶۰ روپے سارک ممالک تین امریکی ڈالر	دائمی خریداری ۴۰۰۰ روپے ایک سو پچھتر امریکی ڈالر

پیش منظر

عنوانات

پیش گفت

شعور وادراک

جمال وکمال

اسلوب وبیان

گوشہء مجنوں گورکھپوری

گوشہء مجنوں گورکھپوری

حسب اعلان "پیش رفت انٹرنیشنل" کا گوشہء مجنوں گورکھپوری حاضر ہے۔ اس گوشے کے لئے جن اہلِ قلم نے قلمی معاونت کی ہم ان کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ ڈاکٹر حنیف فوق، مظہر جمیل، محمد ظفر عالم، پروفیسر افتخار اجمل شاہین، جمال نقوی اور پروین کاظمی کا خصوصی طور پر شکر گزار ہیں کہ انھوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہمیں اپنی نگارشات سے نوازا۔

پیش گفت

خواب، جستجو، عمل اور انسان

افتتاحیہ/ شفیق احمد شفیق

انسانی ذہن خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمیشہ متجسس رہا ہے۔ انسان جنگل کی وحشیانہ زندگی کا سفر طے کر کے آج کی ترقی یافتہ زندگی کے جس سنگ میل تک پہنچا ہے وہ اسی تجسس اور تلاش کا نتیجہ ہے۔ انسان پہلے خواب دیکھتا ہے پھر اس کی تعبیر میں لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواب، جستجو اور عمل انسان کی ذات کے اٹوٹ انگ محسوس ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر انسان خواب دیکھنا چھوڑ دے تو وہ پاگل ہو جائے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ آدمی پاگل ہو کر بھی خواب دیکھتا ہے اور بڑے انہماک کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اسے اپنے معروض حقیقی ہونے کا بھی احساس نہیں رہتا۔ پاگل تو اپنے پورے وجود کے ساتھ خواب دیکھتا ہے۔ انسان صرف مرنے کے بعد ہی خواب سے نجات حاصل کر پاتا ہے۔

میں بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمیشہ متجسس رہا ہوں۔ اور اس حوالے سے میں نے بھی کچھ خواب دیکھے ہیں۔ ان خوابوں میں ایک خواب اہل فن اور ارباب نظر کی دل سے پذیرائی کا حق ادا کرنا شامل ہے۔ آپ سب اہل علم اور اہل دانش ہیں۔ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ اردو رسائل و جرائد کی پوری اشاعتی تاریخ میں کسی رسالے کی طرف سے اردو میں شائع ہونے والی اہم کتابوں پر سالانہ انعامات ان کی پذیرائی کے حوالے سے نہیں دیئے گئے۔ لیکن "پیش رفت انٹرنیشنل" نے اس روایت کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اور خوب سے خوب تر کی جستجو مجھے یہاں تک لے آئی۔ میرے بہت سے خوابوں میں سے ایک خواب اس تقریب کے حوالے سے آج پورا ہو رہا ہے۔ آج کی یہ محفل میرے خواب کی سچی تعبیر ہے۔ میں آج بے پایاں مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہے کہ میں اپنی خوشیوں کا اظہار کر سکوں۔ اس تقریب کی صورت گری میں صرف میرا ذہن ہی مصروف کار نہیں رہا ہے بلکہ ذہن کے ساتھ، دل، دل کے جذبات، تازہ ترامنگوں کی مسلسل نمود، میرے ہاتھ پاؤں، آنکھیں بلکہ میرا پورا وجود اس تقریب کے انعقاد میں بکھرتا اور سمٹتا رہا ہے۔ میرا قلم مسلسل میرے ساتھ رہا ہے۔ میرے کمپیوٹر نے بھی میری بھرپور مدد کی ہے۔ میرے کچھ دوستوں نے بھی میری معاونت کی ہے۔

میں بس آپ سے یہ التماس کرتا ہوں کہ آپ اپنی حوصلہ افزائی کے دریچے اور تعاون کے در مجھ پر

ہمیشہ کھلے رکھیں اور اس خالص علمی و ادبی پذیرائی کی محفل کو ایک مضبوط اور تابناک روایت میں بدل کر اسے امر بنا دیں۔ اسے ایک تاریخ ساز اور مثالی سلسلہ بنا دیں۔ میں زندہ رہوں یا نہ رہوں۔ مگر اس روایت کو ضرور زندہ رکھیے گا۔ یہ آپ ہی سے اور آپ کے بعد آنے والی نسلوں سے قائم و دائم رہ سکتی ہے۔

(یہ افتتاحیہ "پیش رفت انٹرنیشنل" کی تقسیم اسناد کی تقریب میں پڑھا گیا تھا۔ جسے پیش گفت (اداریہ) کے طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔ تقریب ۲۸ مئی ۲۰۰۶ء کو مرکز سادات امروہہ کراچی میں منعقد ہوئی تھی)

"پیش رفت انٹرنیشنل" انعامات برائے سال ۲۰۰۵ء

ہم بصد مسرت اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ سال ۲۰۰۴ء کی طرح اس بار بھی سہ ماہی جریدہ "پیش رفت انٹرنیشنل" کی جانب سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہونے والی مختلف اصناف سے تعلق رکھنے والی اٹھارہ کتابوں پر ان کے مصنفین کو انعامات کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ انعامی مقابلے میں شمولیت کی یہ شرط تھی کہ جو مصنف یا ناشر اپنی کتابیں اس مقابلے میں شامل کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ وہ ہر کتاب کی تین تین کاپیاں دفتر سہ ماہی پیش رفت انٹرنیشنل، آر۔۱۱۸۰ بلاک ۱۸، سمن آباد فیڈرل 'بی' ایریا، گلبرگ ٹاؤن میں جمع کرا دیں۔

جو کتابیں ہم تک اس شرط کے مطابق پہنچیں ہم نے ججوں کی خدمت میں فیصلے کے لئے پیش کر دیں۔ تقریباً ڈھائی سو سے زائد کتابوں کے مطالعے اور تجزیے کے بعد ان کی کتابوں پر "سندِ اعتراف دانش" اور "لوح اعزاز" عطا کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

انعامات کی تفصیلات، انعام یافتگان کے نام، ان کی تصویریں اور ان کی انعام یافتہ کتابوں کے ناموں کی فہرست انشا اللہ "پیش رفت انٹرنیشنل" کی اگلی اشاعت (شمارہ نمبر ۱۶۔۱۵) میں شائع کر دی جائے گی۔

نوٹ: اس بار ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء میں شائع ہونے والی کتابوں پر ایک ساتھ انعامات دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ انعامی مقابلے میں شرکت کے خواہشمند مصنفین، مرتبین اور ناشرین حضرات سے التماس ہے کہ ۱۰ فروری ۲۰۰۸ء تک اپنی اپنی کتابوں کی تین تین کاپیاں ہمیں ارسال کر دیں۔

پیش رفت ۲۰۰۴ء کی تقریب انعامات واسناد کی روداد/ احمد سعید فیض آبادی

کراچی: ایسے وقت میں جب علم وادب سے بیگانگی برتی جارہی ہے۔ تہذیب وثقافت کی قدروں کو پامال کیا جارہا ہے وہاں علم وادب اور قلمکاروں کی پذیرائی کی روایت ڈالنا اور انعامات واعزازات تفویض کرنے کی روایت قائم کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ایسے مایوس کن حالات میں ہمیں دل برداشتہ ہونے کے بجائے شفیق احمد شفیق کی طرف، ان کے کاموں اور ان کے حوصلے کی طرف دیکھنا چاہئے کہ انھوں نے ہوا کے رخ کو بدلنے کی ٹھان لی ہے۔ یہ بات کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پیرزادہ قاسم نے سہ ماہی جریدہ "پیش رفت انٹرنیشنل" کی تقریب تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے کہی جو گزشتہ دنوں حسب اعلان مرکز سادات امروہہ میں منعقد ہوئی۔ پیرزادہ قاسم صاحب نے مزید کہا کہ اس کام کے کرنے میں شفیق احمد شفیق نے کسی کا انتظار نہیں کیا اور ایک نئی روایت کے ساتھ کام کا آغاز کردیا۔ وہ ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ادب لکھتے بھی ہیں اور ادیبوں کی پذیرائی بھی کرنا جانتے ہیں۔ ہم سب کو ان کی تقلید کرنی چاہئے۔ اس تقریب میں مجلس صدور کے معزز اراکین کی حیثیت سے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پروفیسر پیرزادہ قاسم رضا احمد کے علاوہ اردو ڈکشنری بورڈ کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو ڈکشنری بورڈ کے سابق سکریٹری اور چیف ایڈیٹر پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق اور ادبیات پاکستان کے ریجنل ڈائرکٹر آغا نور محمد پٹھان نے بھی شرکت فرمائی۔ نظامت کے فرائض معروف افسانہ نگار اور ٹی وی کے ڈرامہ نویس عاصم صدیقی نے انجام دیئے۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام ربانی اور توصیف محبوب ربانی سے ہوا۔ قراءت ونعت خوانی کی سعادت مظفر حسین نوید نے حاصل کی۔ پیش رفت انٹرنیشنل کے مدیر اعلیٰ، تقریب کے بانی وروح رواں جناب شفیق احمد شفیق نے افتتاحیہ میں کہا کہ انسانی ذہن خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمیشہ متجسس رہا ہے۔ انسان جنگل کی وحشیانہ زندگی کا سفر طے کرکے آج کی ترقی یافتہ زندگی کے جس سنگ میل تک پہنچا ہے وہ اسی تجسس اور تلاش کا نتیجہ ہے۔ انسان پہلے خواب دیکھتا ہے پھر اس کی تعبیر میں لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواب، جستجو اور عمل انسان کی ذات کے اٹوٹ انگ محسوس ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر انسان خواب دیکھنا چھوڑ دے تو وہ پاگل ہوجائے۔ مگر میں سمجھتا

ہوں کہ آدمی پاگل ہو کر بھی خواب دیکھتا ہے اور بڑے انہماک کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اسے اپنے معروض حقیقی ہونے کا بھی احساس نہیں رہتا۔ پاگل تو اپنے پورے وجود کے ساتھ خواب دیکھتا ہے۔ انسان صرف مرنے کے بعد ہی خواب سے نجات حاصل کر پاتا ہے۔

میں بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمیشہ متجسس رہا ہوں۔ اور اس حوالے سے میں نے بھی کچھ خواب دیکھے ہیں۔ ان خوابوں میں ایک خواب اہل فن اور ارباب نظر کی دل سے پذیرائی کا حق ادا کرنا شامل ہے۔ آپ سب اہل علم اور اہل دانش ہیں۔ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ اردو رسائل و جرائد کی پوری اشاعتی تاریخ میں کسی رسالے کی طرف سے اردو میں شائع ہونے والی اہم کتابوں پر سالانہ انعامات ان کی پذیرائی کے حوالے سے نہیں دیئے گئے۔ لیکن ''پیش رفت انٹرنیشنل'' نے اس روایت کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اور خوب سے خوب تر کی جستجو مجھے یہاں تک لے آئی۔ میرے بہت سے خوابوں میں سے ایک خواب اس تقریب کے حوالے سے آج پورا ہو رہا ہے۔ آج کی یہ محفل میرے خواب کی سچی تعبیر ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ اسی طرح دوسروں کے بھی خواب پورے ہوں۔ اس کے بعد شہناز پروین نے ''پیش رفت انٹرنیشنل اور اس کے مدیر اعلیٰ کی کارکردگی کے حوالے سے ایک جامع تعارف پیش کیا اور کہا کہ شفیق احمد شفیق ایک اچھے شاعر، استاد اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل اور جدت پسند مدیر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے رسالے ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کا زیہ و تبصرہ نمبر شائع کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہی تھا کہ ایک اور بڑا کام انھوں نے ۲۱ قلمکاروں کو لوح اعزاز اور سند اعتراف کمال و دانش کی روایت کی بنیاد ڈالی۔ جس کی عملی صورت آج آپ کے سامنے ہے۔ اس کے بعد اسٹیج سکریٹری عاصم صدیقی نے باری باری انعام یافتگان کو انعام لینے کی دعوت دینی شروع کی اور ہر انعام یافتہ قلمکار کا ان کو انعام دینے سے پہلے ان کا مختصر تعارف بھی پیش کیا جاتا رہا۔ جن ۲۱ کو کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا ان کے نام یہ ہیں، ڈاکٹر محمد علی صدیقی/ سجاد ظہیر انعام، جمال پانی پتی/ مولانا الطاف حسین حالی انعام، پروفیسر آفاق صدیقی/ مولانا محمد حسین آزاد انعام، عشرت رومانی/ اختر حسین رائے پوری انعام، جمال نقوی/ سر سید احمد خان انعام، ڈاکٹر شکیل نوازش، رضا/ ڈپٹی نذیر احمد انعام، سید نعمت اللہ/ پروفیسر احتشام حسین انعام، پروفیسر نجم الہدیٰ/ علامہ شبلی نعمانی انعام، ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی/ میر ببر علی انیس انعام، ادیب سہیل/ مرزا سلامت علی دبیر انعام، پروفیسر افتخار اجمل شاہین/ سیماب اکبر آبادی انعام، اختر سعیدی/ جمیل مظہری انعام، شہناز نور/ علامہ رضا علی وحشت انعام، ظہیر بیدری/ پروفیسر مجنوں گورکھپوری

انعام، آغا گل/ منشی پریم چند انعام، ناصر بغدادی/ سعادت حسن منٹو انعام، قیصر سلیم/ سید سبط حسن انعام، محمد اسمٰعیل یوسف/ آغا حشر کاشمیری انعام، محمد حامد سراج/ رشید احمد صدیقی انعام، احمد زین الدین/ صبا اکبر آبادی انعام، اعتراف کمال و دانش: فضا اعظمی/ شاہ عبداللطیف بھٹائی انعام۔ یہ انعام فضا اعظمی کو ان کی مجموعی علمی و ادبی کارکردگی پر دیا گیا ہے۔ جن قلمکاروں نے انعام یافتگان کا تعارف پیش کیا ان کے نام یہ ہیں۔ احمد سعید فیض آبادی، سلمان صدیقی، زاہد رشید، پروین حیدر، حمیرا راحت، حامد علی سید، رومانہ رومی، نداعلی اور فائزہ غزل۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے پیش رفت انٹر نیشنل کی جانب سے انعامات تفویض کرنے کی روایت کے آغاز کو سراہتے ہوئے اپنے ارسال کردہ پیغام میں کہا کہ ""پیشرفت انٹر نیشنل کی جانب سے اردو ادبا کو ان کی بے مثال تخلیقی کارکردگی کے حوالے سے انعامات و اعزازات دینے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آگے چل کر اس سلسلے کے نہایت خوشگوار اثرات پوری اردو دنیا پر مرتب ہوں گے۔ عوامی سطح پر اعلیٰ تخلیقی کارکردگی کے اعتراف سے نئی نسل خود کو پورے معاشرے سے جڑا ہوا محسوس کرے گی اور کسی قسم کی فرسٹریشن کی زد میں آنے سے محفوظ رہے گی۔ ادب کے میدان میں ""پیش رفت انٹر نیشنل"" کے منتظمین کی یہ ایک اہم پیش رفت ہے جس کے لئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔" یہ پیغام پروفیسر شبنم صدیقی نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد عاصم صدیقی نے مجلس صدور میں سے پہلے ادبیات اکیڈمی کے ریجنل ڈائرکٹر آغا نور محمد کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ انھوں نے ""پیش رفت انٹر نیشنل"" کی انعامی روایت کے آغاز کو سراہتے ہوئے کہا کہ شفیق احمد شفیق کو میں جانتا ہوں کہ وہ دھن کے پکے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے ک وہ انتہائی محنتی انسان بھی ہیں۔ آج کی اتنی بڑی باوقار تقریب میرے دعوے کی تصدیق کرتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ نجی اداروں کو بھی چاہئے کہ ""پیش رفت انٹر نیشنل"" کی طرح انعامات کا سلسلہ شروع کریں۔ انھوں نے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کراچی یونیورسٹی اور ملک کی دوسری جامعات کو بھی چاہئے کہ وہ ان کو جنھوں نے علم و ادب اور فکر و فن کیلئے خود کو وقف کر رکھا ہے ان کو انعامات و اعزازت سے نوازیں۔ ڈاکٹر حنیف فوق نے ""پیش رفت انٹر نیشنل"" کے معیار اور اس کے مدیر اعلیٰ کے حسن تدوین و ترتیب کی تعریف کی اور اسے ایک معیاری علمی و ادبی مجلّہ قرار دیا۔ انھوں نے انعامات و اعزازات کے حوالے سے کہا کہ یہ ایک منفرد سلسلہ ہے۔ اس کے لئے شفیق احمد شفیق لائق مبارکباد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں آج جتنے لوگ شریک ہیں وہ سب کے سب اہل علم و دانش ہیں۔ اور قابل لحاظ مقامات و مرتبہ کے حامل ہیں۔ اس لئے اس محفل کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد ناگزیر وجوہ سے شرکت نہ کر سکے مگر ایک معذرت نامہ جو

پیغام کی صورت میں تھا انھوں نے بھجوادیا تھا جسے تقریب کے ناظم عاصم صدیقی نے پڑھ کر حاضرین محفل کو سنایا۔ ڈاکٹر منظور نے لکھا تھا کہ "مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کی تقریب بسلسلہ تقسیم سند اعتراف دانش و اعزاز فضیلت میں شرکت نہیں کر سکوں گا۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ میری ذمہ داریوں میں کچھ اضافہ ہوگا ہے اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں مجھے ریکٹر کے فرائض بھی انجام دینے پڑ رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں مجھے چند انتہائی ضروری کاموں کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑ رہا ہے اور سوء اتفاق کہ میں ۲۸ کی شام کو سات بجے رواہ ہوجاؤں گا۔ تاکہ ۲۹ کی صبح ۹ بجے ایک ضروری میٹنگ میں شرکت کر سکوں۔ میں آپ کی انتھک کوششوں اور آپ کے علم و ادب سے کمٹ منٹ پر آپکو مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ جس طرح وسائل کی کمی کے باوجود صبح سے شام تک کارکن کی حیثیت سے مصروف رہتے ہیں وہ قابل ستائش ہے اور خود آپ کو ایک بڑی سند اعتراف دانش و فضیلت کا مستحق قرار دیتی ہے۔ آپ کا رسالہ "پیش رفت انٹرنیشنل" اردو کی علمی و ادبی روایات کو زندہ رکھنے میں بڑا کام سرانجام دیتا ہے۔ اور مجھے اندازہ ہے کہ اس سالے کو پابندی سے نکالتے رہنے میں آپ کو کتنی محنت اور مشقت برداشت کرنی ہوتی ہے۔ مگر علم و ادب کا کام سرپھرے لوگ ہی کر سکتے ہیں جو اگرچہ ہمارے معاشرے میں کم ہیں۔ پھر بھی آپ جیسے لوگوں کی شکل میں موجود ہیں۔ حسن اتفاق سے ڈاکٹر منظور احمد کی بات سچ ثابت ہوئی اور شفیق احمد شفیق کو ان کی گراں قدر ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں پاکستان ادبیات اکاڈمی کی جانب سے اس کے ریجنل ڈائرکٹر آغا نور محمد پٹھان نے اور حبیب احسن مدیر "خیال" نیا لگ الگ لوح اعزاز (شیلڈ) پیش کئے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ شفیق احمد شفیق نے اپنے افتتاحیہ میں جو خواب دیکھنے کی بات کی ہے وہ بہت اہم اور کلیدی نوعیت کی ہے۔ انسان کی ترقی و خوشحالی کا انحصار اسی خواب دیکھنے کے عمل سے ہے۔ یہی عمل اسے اضطراب میں رکھتا ہے۔ اور وہ مطمئن نہیں ہوتا۔ خوب سے خوب تر کی جستجو اسے بے چین رکھتی ہے۔ شفیق احمد شفیق نے ٹھیک کہا ہے کہ پہلے آدمی خواب دیکھتا ہے اور پھر اس کی تکمیل میں لگ جاتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے مزید کہا کہ آج کی یہ تقریب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے منفرد ہے۔ اس کے لئے "پیش رفت انٹرنیشنل" کے مدیر اعلیٰ ہر لحاظ سے لائق تحسین ہیں۔ آخر میں "پیش رفت انٹرنیشنل" کے ناشر کی حیثیت سے روشن خیال نازش نے مجلس صدور، انعام یافتگان اور حاضرین کی خدمت میں اظہار تشکر پیش کیا اور عشائیہ کی دعوت دی۔

ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا پیغام

"پیش رفت انٹرنیشنل" کی جانب سے اردو ادباء کو ان کی بے مثال تخلیقی کارکردگی کے حوالے سے انعامات و اعزازات دینے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آگے چل کر اس سلسلے کے نہایت خوشگوار اثرات پوری اردو دنیا پر مرتب ہوں گے۔ عوامی سطح پر اعلیٰ تخلیقی کارکردگی کے اعتراف سے نئی نسل خود کو پورے معاشرے سے جڑا ہوا محسوس کرے گی اور کسی قسم کی Frustration کی زد پر آنے سے محفوظ رہے گی۔

ادب کے میدان میں "پیش رفت انٹرنیشنل" کے منتظمین کی یہ ایک اہم پیش رفت ہے۔جس کے لئے وہ قابل مبارک باد ہیں۔"

ڈاکٹر وزیر آغا

سرگودھا

ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا معذرت نامہ

محترم جناب شفیق احمد شفیق صاحب' السلام علیکم

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کی تقریب بسلسلہ تقسیم سند واعتراف دانش واعزاز فضیلت میں شرکت نہیں کرسکوں گا۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ میری ذمہ داریوں میں کچھ اضافہ ہوگیا ہے اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں مجھے ریکٹر کے فرائض بھی انجام دینے پڑ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے چند انتہائی ضروری کاموں کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑ رہا ہے اور سوء اتفاق کہ میں ۲۸ر کی شام کو سات بجے روانہ ہوجاؤں گا تاکہ ۲۹ر کی صبح ۹ بجے میں ایک ضروری میٹنگ میں شرکت کرسکوں۔ میں آپ کی انتھک کوششوں اور آپ کے علم وادب سے کمٹمنٹ پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ جس طرح وسائل کی کمی کے باوجود صبح سے شام تک انتھک کارکن کی حیثیت سے مصروف رہتے ہیں وہ قابل ستائش ہے اور خود آپ کو ایک بڑی سند اعتراف دانش وفضیلت کا مستحق قرار دیتی ہے۔

آپ کا رسالہ "پیش رفت انٹرنیشنل" اردو کی ادبی اور علمی روایات کو زندہ رکھنے میں بڑا کام سرانجام دیتا ہے۔ اور مجھے اندازہ ہے اس رسالے کو پابندی سے نکالتے رہنے میں آپ کو کتنی محنت اور مشقت کرنی ہوتی ہے۔ مگر علم وادب کا کام صرف سرپھرے لوگ ہی کرسکتے ہیں جو اگرچہ ہمارے معاشرے میں کم ہیں مگر پھر بھی آپ جیسے لوگوں کی شکل میں موجود ہیں۔ اگر یہ معدودے چند افراد موجود نہ ہوں تو معاشرتی روش جو تجارت اور کامرس کے رجحانات کی پرورش کررہی ہے بڑی تیزی سے معاشرے کو ایک بالکل کاروباری اور استحصالی معاشرے میں تبدیل کردے گی۔ آپ جیسے لوگ جو علم وادب کے دیئے جلائے رکھتے ہیں' ہمارے معاشرے کے لئے انتہائی ضروری ہیں اور قابل مبارکباد بھی۔

میں آج کی محفل میں سند واعتراف دانش واعزاز فضیلت پانے والوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں بے شک ان میں ہر شخص بجا طور پر بڑے سے بڑے اعزازات کا حقدار ہے۔ علم وادب کی دنیا میں ان کا ایک اعلیٰ مقام ہے اور ان کی خدمات معاشرے کے لئے بڑی وقیع ہیں۔

آپ کے جلسے میں حاضر نہ ہوسکنے کی معذرت کے ساتھ۔ والسلام

ڈاکٹر منظور احمد

"پیش رفت انٹرنیشنل" کے حوالے سے مظہر امام صاحب کا خط

آپ کے توسط سے شفیق احمد شفیق صاحب کا رسالہ "پیش رفت انٹرنیشنل" پا کر بہت خوشی ہوئی۔ اس میں میری دلچسپی کی بہت سی چیزیں ملیں اور میں نے تقریباً پورا رسالہ پڑھا۔ ان کا اداریہ اس لائق ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی جائے۔ "پیش رفت انٹرنیشنل انعامات" کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اس میں ایک طرح کی ندرت اور انفرادیت بھی ہے۔ میری طرف سے مبارک باد دیجئے۔ شفیق صاحب کا تعلق غالباً مغربی بنگال سے ہے۔ کراچی میں شاید ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور عمدہ تنقیدی زبان لکھنے پر قادر ہیں۔ آپ انھیں میری کتاب / کتابیں پڑھنے کو دیجئے۔ "پیش رفت انٹرنیشنل" کا نیا شمارہ چھپا ہو تو بھجوایئے گا۔

آپ سے ایک اور کتاب کے لئے بطورِ خاص درخواست ہے۔ سید نعمت اللہ صاحب سے میں واقف نہیں۔ انہیں ان کی کتاب "تلامذہ شاد" پر "پیش رفت انٹرنیشنل انعام" دیا گیا ہے۔ میری طرف سے انھیں مبارک باد دیجئے اور گزارش کیجئے کہ وہ اپنی کتاب "تلامذہ شاد" کی ایک جلد میرے لئے مرحمت فرمائیں۔ میرے ماموں منظور احمد نظر در بھنگوی، شاد کے شاگرد تھے۔ قیس کی کتاب "گلشن حیات" میں ان کا ذکر ہے۔ پروفیسر اقبال عظیم کی کتاب "مشرقی بنگال میں اردو" میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔ میرا ایک طویل مضمون ان کے بارے میں میری کتاب "ایک لہر آتی ہوئی" میں شامل ہے۔ میرا خیال ہے کہ نعمت اللہ صاحب کی کتاب میں ان کا بھی ذکر ہوگا۔ نہ ہو تب بھی، مجھے ان کی یہ کتاب چاہئے۔ وہاب اشرفی کو یہ کتاب ملی ہے۔

نوٹ: یہ خط مظہر امام صاحب نے پروفیسر افتخار اجمل شاہین صاحب کے نام لکھا ہے۔ چونکہ اس میں "پیش رفت انٹرنیشنل"، اس کے مندرجات، ادبی انعامی سلسلے اور اس کے اداریے کا ذکر ہے اس لئے افتخار اجمل صاحب کی اجازت سے اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

☆......☆

محمد حامد سراج کا معذرت نامہ

سامعین محترم السلام علیکم

اک عمر گزری کتاب نوردی میں۔ آج مجھے الفاظ کے قحط اور تہی دامنی کا احساس دامن گیر ہے۔ مجھے اس دن کا کس شدت سے انتظار تھا، آپ شاید اندازہ نہ کرسکیں۔ میرا مشتاق احمد شفیق صاحب سے انٹرنیٹ پر مسلسل رابطہ رہا۔ اس تقریب کے انعقاد کے سلسلے میں وہ جن مشکلات سے گزرے مجھے ان کی محنت، جاں فشانی اور انتھک تگ و دو کا اندازہ اور احساس ہے۔ مسائل، دکھ اور ذمہ داریاں کانٹے کاٹتے ہماری سانسیں کٹ جاتی ہیں۔ زندگی ایک ایسی پونجی ہے۔ جس میں سے روز ایک دن کی کٹوتی ہو جاتی ہے۔ اور ہمیں اپنی کل پونجی کی خبر ہی نہیں دی گئی۔ زندگی مصروفیات سے عبارت ہے...... مجھے خورشید رضوی کا شعر یاد آرہا ہے۔

وہ جو اک اکائی میری ذات کی تھی نہ جڑسکی
یہ جو ریزہ ریزہ سے کام تھے مجھے کھا گئے

میرے من میں کتنی باتیں تھیں۔ لیکن اب گفتگو کو طویل نہیں دینا ہے۔ "پیش رفت انٹرنیشنل" کے پلیٹ فارم سے "رشید احمد صدیقی انعام" میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ میں ادب میں طفل مکتب ہوں یہ کسر نفسی نہیں حقیقت ہے۔ میرے اندر رشید احمد صدیقی کی "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسان رفتہ" آج بھی تر و تازہ ہے۔ کتاب ہی میری محبت، میرا عشق اور جنوں ہے۔ میں کتابوں میں سانس لیتا ہوں۔ میری پسندیدہ خوشبو کتاب کی خوشبو ہے۔

روشنیوں کے اس شہر سے ناچیز کی تخلیق "میا" کو جو ایوارڈ دیا گیا وہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ انعام کسی سفارش کی بنیاد پر نہیں دیا گیا۔ میں پاکستان کے ایک دور افتادہ گاؤں خانقاہ سراجیہ میں رہتا ہوں۔ بڑے شہروں اور میڈیا سے روابط نام کی کوئی کڑی میرے نام اور تخلیق سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ دبستان کراچی نے مجھے ہمیشہ عزت اور اہمیت دی۔ مجھے اس بات سے کوئی علاقہ نہیں کوئی شہر دبستان کہلا سکتا ہے کہ نہیں۔ لیکن میں کراچی کو ایک اہم ترین دبستان سمجھتا ہوں۔ اور بات دلیل سے

کروں گا۔ میرا برسوں پر محیط تجربہ شاہد ہے کہ کراچی کے ادبی جرائد کے محترم مدیران کرام نے کوئی ایسا گروپ تشکیل نہیں دیا کہ مخصوص ادباء کے علاوہ کوئی اور اس میں داخل نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی کا ''صریر'' ہو' مبین مرزا کا مکالمہ ہو یا محمود واجد کا ''آئندہ''......ہم ناصر بغدادی کے ''بادبان'' کی بات کریں یا آصف فرخی کے ''دنیازاد'' کی......ایک عرصہ ''سخنور'' کی آب و تاب رہی......اہم ترین ادبی رسائل میں' احمد زین الدین کا ''روشنائی'' ہو' ''ارتقا'' کے اعلیٰ معیار کی بات ہو......اور یہ سفر شفیق احمد شفیق کے ''پیش رفت انٹرنیشنل'' تک محیط ہو جائے۔ یہ وہ تمام جرائد ہیں جنھوں نے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔

میں ایک قاری ہوں' صرف قاری...... میں نے اپنے ادبی مطالعہ کا آغاز ''نقوش''، ''فنون''، ''اوراق''، ''ادب لطیف'' اور ''سویرا'' سے کیا تھا۔

دبستان کراچی کے جن جرائد کا میں نے ذکر کیا ہے یہ وہ تابناک اور خالص ادبی جرائد ہیں جنھوں نے مجھ جیسے ناچیز کے افسانوں کو اپنے قیمتی صفحات میں جگہ دی اور ان کی حوصلہ افزائی کی بدولت میرے افسانوی مجموعے ''وقت کی فصیل'' اور ''برائے فروخت'' کی اشاعت ممکن ہوئی۔

''میا'' میرا ذاتی دکھ ہے۔ آپ نے اس کتاب کو عزت دے کر میرا دکھ بانٹا ہے۔ میں محترم شفیق احمد شفیق صاحب اور اس کمیٹی کا شکر گزار ہوں جس نے اس ناچیز کے بے وقعت الفاظ کو توقیر دے کر باوقار کر دیا۔

میں تمام انعام یافتگان کو مبارک باد دیتا ہوں۔

سامعین محترم! مجھے خوشی ہے' فخر ہے کہ مجھے اہل علم نے اس انعام سے نوازا ہے۔ یہاں کوئی جوڑ توڑ والی کمیٹی نہیں تھی۔ یہاں سفارش کے سکے رائج نہیں تھے۔ شفیق احمد شفیق یقینی طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میری ان سے ایک بھی بالمشافہ ملاقات نہیں' یہ التفات غائبانہ محبت کے ثمرات ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ آپ سب حضرات کا شکریہ۔

محمد حامد سراج

بدھ ۱۰؍مئی ۲۰۰۶ء

''پیش رفت انٹرنیشنل'' اور اس کے مدیر کی کارکردگی کی مختصر جھلکیاں

شہناز پروین

شفیق احمد نے اپنا تخلص بھی شفیق رکھ کر اپنے آپ کو اسم بامسمیٰ بنا دیا ہے۔ میں نے کبھی ان کی ایک غزل پڑھی تھی۔ جس کے دو شعر مجھے اب بھی یاد ہیں۔

کسی کا دل نہ دکھے تم یہ دھیان میں رکھنا
مٹھاس لہجے میں نرمی زبان میں رکھنا

اور

ہوا کو اپنا موافق بنا کے رخ بدلے
اک ایسا وصف بھی تم بادبان میں رکھنا

انھیں پڑھنے اور ان سے ملنے کے بعد احساس ہوا، یہ وصف ان میں رچا ہوا ہے۔ درس و تدریس کے پیشے سے وابستگی کی بنا پر یہ رنگ اور بھی زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ کیوں کہ ایک اچھے استاد میں یہ وصف ہونا لازمی ہے۔

شفیق احمد شفیق کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ ایک قابل اور شفیق استاد، اچھا افسانہ نگار، خوش آہنگ اور روشن خیال شاعر، سلجھے ہوئے متوازن زاویہ، فکر و نظر رکھنے والے ترقی پسند تنقید نگار، بیباک صحافی، علمی و ادبی اقدار کا ادراک رکھنے والے باشعور مدیر کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

کراچی میں جہاں بہت سارے رسائل و جرائد نکل رہے ہیں۔ خالص علمی اور ادبی جرائد کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ افکار اور صریر کے بند ہو جانے کے بعد یہ کمی اور بھی زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگی ہے۔ ادبی رسالے شائع کرنا یوں بھی گھاٹے کا سودا ہی ہوتا ہے۔ لیکن شفیق احمد شفیق پرعزم آدمی ہیں۔ علم و ادب کی قدروں کو آگے بڑھانے میں شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں اور ہر لمحے ''کچھ کر دکھانا ہے'' پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ جب تک اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا لیتے نچلے نہیں بیٹھتے۔ انگریزی اور اردو ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی تحریروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم اور جدید

ادوار کی تخلیقات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور فن کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔

تنقیدی مضامین پر مشتمل مجموعے ''ادراک'' پر انھیں ''فراق گورکھپوری ادبی سمٹ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ انگریزی میں مختلف ادبا و شعرا کے فکر و فن کے تجزیے پر مشتمل دو مجموعے بہت جلد طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آنے والے ہیں، جو مجھے یقین ہے صاحبان علم و ادب میں پذیرائی حاصل کریں گے۔

شفیق احمد شفیق ماہنامہ ''لوح و قلم''، ''جامِ نو''، ''پاکستانی ادب'' اور مجلس سے منسلک رہے۔ اس کے علاوہ روزنامہ ''پاسبان''، ہماری آواز''، ''وطن'' او ہفت روزہ ''سب رنگ''، ''نکہت'' اور ''جریدہ'' سے بھی ایک عرصے تک وابستہ رہے۔ اس وقت بھی وہ انگریزی روزنامہ ''بزنس ریکارڈر'' سے منسلک ہیں۔

''پیش رفت انٹرنیشنل'' کے پہلے شمارے سے لے کر بارہویں شمارے تک انھوں نے اتنے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ ان کی نشاندہی ضروری ہے۔ پہلا شمارہ نوشاد نوری پر خصوصی گوشے کی بنا پر خاص اہمیت کا حامل تھا۔

دوسرا خواجہ ریاض الدین عطش نمبر تھا۔ جس میں خواجہ صاحب کے شخصیت اور فن کے تقریباً تمام گوشوں کو اجاگر کرنے کی سعی تھی۔ تیسرا اور چوتھا شمارہ نون۔ جاوید نمبر تھا۔ جس میں ان کی زندگی اور شاعری پر مقالات لکھوائے گئے تھے۔ پانچویں اور چھٹے شمارے میں مختلف قلمکاروں کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ پروفیسر اظہر قادری کے علمی و ادبی کارناموں پر محیط بھرپور گوشہ بھی مختص کیا گیا تھا جس میں اظہر قادری کی تخلیقی اور تنقیدی کارکردگیوں کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا گیا تھا۔

شفیق احمد شفیق کا بڑا اہم کارنامہ ''تجزیہ و تبصرہ نمبر'' ہے۔ جو اردو رسالے کی تاریخ میں پہلی مثال ہے۔ اس نمبر میں کتب و جرائد پر مختلف قلمکاروں کے تجزیے اور تبصرے شامل ہیں۔

اسی طرح شمارہ نمبر نو اور دس کی اہمیت یہ ہے کہ اردو رسالے کی اشاعت کی تاریخ میں پہلی بار ۲۱ قلمکاروں کو ان کی کتابوں پر ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کی جانب سے ''پیش رفت انٹرنیشنل انعامات اور اسناد'' دینے کا اعلان کیا گیا ہے اور ان کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ کسی ایک قلمکار کی مجموعی علمی اور ادبی کارکردگی پر بھی ایک انعام مختص کیا گیا ہے۔

گیارہویں اور بارہویں شمارے میں انعام یافتگان کے بارے میں مشاہیر کی آرا کے ساتھ ساتھ

مختلف مختلف قلمکاروں کی نگارشات سے مجلّے کو مزین کیا گیا ہے۔ آج کی تقریب انھیں دو شماروں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

شفیق احمد شفیق نے قلمکاروں کو خراج تحسین پیش کرنے کا جو عملی قدم اٹھایا ہے وہ یقیناً قابل ستائش و تحسین ہے۔ یہ پہلا ادبی جریدہ ہے جس نے یہ مثبت اور مستحسن روایت قائم کی ہے۔

ڈائجسٹوں میں لکھنے والے قلم کاروں کو اعزازیے بھی ملتے ہیں اور انعامات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ مگر ادبی رسائل میں یہ پہلا رسالہ ہے جس نے ادیبوں اور شاعروں کی کاوشوں پر مشتمل کتابوں پر انعامات سے نوازنے کا جو سلسلہ قائم کیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

آج ۲۸ رمئی ۲۰۰۶ء کو تخلیق کاروں کی پذیرائی کے لئے ایسی خوبصورت اور حوصلہ افزا محفل سجانے کے لئے میں جناب شفیق احمد شفیق کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتی ہوں۔
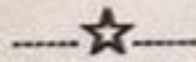
------☆------

مجلس صدور کے معزز اراکین کے خطابات سے مختصر اقتباسات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مدیر اعلیٰ اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ شفیق احمد شفیق نے اپنے افتتاحیہ میں جو خواب دیکھنے کی بات کی ہے وہ بہت اہم اور کلیدی نوعیت کی ہے۔ انسان کی ترقی وخوشحالی کا انحصار اسی خواب دیکھنے کے عمل سے ہے۔ یہی عمل اسے اضطراب میں رکھتا ہے۔ اور وہ مطمئن نہیں ہونے دیتا۔ خوب سے خوب تر کی جستجو اسے بے چین رکھتی ہے۔ شفیق احمد شفیق نے ٹھیک کہا ہے کہ پہلے آدمی خواب دیکھتا ہے اور پھر اس کی تکمیل میں لگ جاتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے مزید کہا کہ آج کی یہ تقریب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے منفرد ہے۔ اس کے لئے ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کے مدیر ہر لحاظ سے لائق تحسین ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق سابق مدیر اردو ڈکشنری بورڈ کراچی

ڈاکٹر حنیف فوق نے ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کے معیار اور اس کے مدیر اعلیٰ کے حسن تدوین وترتیب کی تعریف کی اور اسے ایک معیاری علمی وادبی مجلّہ قرار دیا۔ انھوں نے انعامات واعزازات کے حوالے سے کہا کہ یہ ایک منفرد سلسلہ ہے۔ اس کے لئے شفیق احمد شفیق لائق مبارکباد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں آج جتنے لوگ شریک ہیں وہ سب کے سب اہل علم ودانش ہیں۔ اور قابل لحاظ مقامات ومرتبہ کے حامل ہیں۔ اس لئے اس محفل کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد سابق وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی

نوٹ: ڈاکٹر منظور احمد ناگزیر وجوہ سے شرکت نہ کر سکے مگر ایک معذرت نامہ جو پیغام کی صورت میں تھا انھوں نے بھجوا دیا تھا جسے تقریب کے ناظم عاصم صدیقی نے پڑھ کر حاضرین محفل کو سنایا۔ صفحہ نمبر پر شائع کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ آج کی یہ تقریب صرف کراچی ہی نہیں

بلکہ پوری اردو دنیا کے لئے ایک منفرد اور مثالی حیثیت کی حامل ہے۔ ایسے وقت میں جب علم و ادب سے بیگانگی برتی جارہی ہے۔ تہذیب و ثقافت کی قدروں کو پامال کیا جارہا ہے وہاں علم و ادب اور قلمکاروں کی پذیرائی کی روایت ڈالنا اور انعامات و اعزازات تفویض کرنے کی روایت قائم کرنا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ایسے مایوس کن حالات میں ہمیں دل برداشتہ ہونے کے بجائے شفیق احمد شفیق کی طرف ان کے کاموں اور ان کے حوصلے کی طرف دیکھنا چاہئے کہ انھوں نے ہوا کے رخ کو بدلنے کی ٹھان لی ہے۔ انھوں نے کسی کا انتظار نہیں کیا اور ایک نئی روایت کے ساتھ کام کا آغاز کردیا ہے۔ وہ ایک بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ادب لکھتے بھی ہیں اور ادیبوں کی پذیرائی بھی کرنا جانتے ہیں۔ ہم سب کو ان کی تقلید کرنی چاہئے۔

آغا نور محمد پٹھان ریزیڈنٹ ڈائرکٹر اکادمی ادبیات کراچی

ادبیات اکیڈمی کے ریجنل ڈائرکٹر آغا نور محمد نے "پیش رفت انٹرنیشنل" کی انعامی روایت کے آغاز کو سراہتے ہوئے کہا کہ شفیق احمد شفیق کو میں جانتا ہوں کہ وہ دھن کے پکے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ انتہائی محنتی انسان بھی ہیں۔ آج کی اتنی بڑی باوقار تقریب میرے دعوے کی تصدیق کرتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ نجی اداروں کو بھی چاہئے کہ "پیش رفت انٹرنیشنل" کی طرح انعامات کا سلسلہ شروع کریں۔ انھوں نے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کراچی یونیورسٹی اور ملک کی دوسری جامعات کو بھی چاہئے کہ وہ ان کو جنھوں نے علم، ادب اور فکر و فن کیلئے خود کو وقف کر رکھا ہے ان کو انعامات و اعزازت سے نوازیں۔

☆......☆

اظہارِ تشکر

روشن خیال نازش

(ناشر ''پیش رفت انٹرنیشنل'')

ذی وقار مجلس صدور کے معزز اراکین، محترم انعام یافتگان اہل قلم ،حاضرین، سامعین اور ناظرین: السلام علیکم۔

میں جریدہ ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کے ناشر کی حیثیت سے مجلس صدور کی قابل احترام شخصیات ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا احمد، ڈاکٹر حنیف فوق، رؤف صدیقی صوبائی وزیر امور داخلہ سندھ، مدیر روزنامہ ''جنگ'' محترم محمود شام، حکیم شفیق احمد، عبدالحسیب خان اور ادبیات اکیڈمی کے ریجنل ڈائرکٹر محترم نور محمد پٹھان صاحبان کا بے حد ممنون ہوں کہ ان حضرات نے اپنا قیمتی وقت علم وادب کے لئے صرف کیا اور ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کی اس محفل میں شرکت فرما کر اس کی رونق کو دوبالا کیا۔

سپاس گزاری کے ساتھ ساتھ ان قلمکاروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے ''پیش رفت انٹر نیشنل'' اسنادو انعامات حاصل کئے اور اس محفل میں آنے کی زحمت فرمائی۔

بہت زیادہ شکریہ حاضرین وسامعین کا جنھوں نے اتوار کی چھٹی کی تفریح میں سے علم وادب کے لئے تھوڑا سا وقت نکالا اور کمال ضبط وتحمل کے ساتھ تقریب کی کاروائیوں کا مشاہدہ کیا۔

میں ان حضرات کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے اس محفل کی آراستگی اور انتظامی کاروائیوں میں ہر قدم پر تعاون کیا۔

نئی کہانی کا نیا پن / عبدالصمد

اصل میں نیا پن اپنے آپ میں کوئی مکمل نئی نویعت نہیں ہوتا، جس چیز کو ہم نیا کہتے ہیں، وہ کسی پرانی ہی چیز کی بدلی ہوئی شکل ہوتی ہے۔ مثلاً گندم ہر سال پیدا ہوتا ہے اور ہر فصل پر ہم نئے گندم کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہم گندم کو ایک دم نیا کہہ سکتے ہیں......؟ آدم علیہ السلام کے واقعہ سے لے کر آج تک ہم نے گندم کی کتنی فصلیں دیکھی ہیں......؟

ارتقا ایک مستقل عمل ہے جو کہیں ٹھہرتا نہیں اس کے ٹھہر جانے کا مطلب ہے موت، اور موت کے بعد Infinity کا لا متناہی سلسلہ۔ آج کہانی کی جو بھی نئی شکل ہے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس کا تعلق کہیں نہ کہیں سے علی محمود سے ضرور ملتا ہے۔ اس پر کہیں پرے سے پریم چند کا ایک سایہ ضرور پڑتا ہے۔

ہم اس دنیا میں رہتے ہیں جہاں ٹوٹل ریجکشن (Total rejection) کی ایک روایت شروع ہوتی تھی، ایک آندھی آئی جس نے ہمیں سمجھا دیا کہ پریم چند ختم ہو چکا ہے۔ ایک طوفان آیا جس نے ہمیں اطلاع دی کہ کرشن چندر Irrelevent.......... ظاہر ہے کہ مصنوعی طور پر کٹ جانے کے بعد کہانی کار کے پاس اور کیا رہ گیا۔ تہی دست کہانی کار..........

اور ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۰ کا دور..........!

اور پھر ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۰ کا دور..........

پھر ۱۹۸۰ سے ۱۹۹۰ کا دور..........

ایک جینوین کہانی کار ارتقا کو قبول کرتے ہوئے علی محمود سے چل کر قاسم خورشید تک آیا۔

آج کی کہانی کیا ہے......؟

پریم چند کا کسان ایک طرف زمین داروں اور ساہوکاروں کے ظلم سے پس رہا تھا، دوسری طرف اسے غیر ملکی بے رحم حکمرانوں کا سامنا تھا۔ آج کا کسان اقتدار کے ان دلالوں سے جوجھ رہا ہے جو ایک فلاحی ریاست کے ہر اچھے کام کو ناکام بنا دینے کے درپے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کردار وہی ہے، زمین وہی ہے، کسان کے ہاتھ میں ہل بیل وہی ہے۔ لیکن حالات بدلے ہوئے ہیں۔ واقعات بدلے ہوئے

ہیں۔ان ہی بدلے ہوئے حالات اور واقعات کی بنیاد پر ہم نئی کہانی کی دریافت کر سکتے ہیں۔

ہماری آنکھوں کے سامنے ہر وقت اور ہر لمحہ ایک صورتِ حال رہتی ہے جو اسکرین کے پردے کی طرح اپنے رنگ بدلتی رہتی ہے۔ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہوتا رہتا ہے، کوئی واقعہ سیدھا سادا اور بے ضرر نہیں ہوتا' اسے دیکھنے' سمجھنے اور اس کی معنویت تلاش کرنے کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ سیاست اب ایوانوں اور قصروں میں مقید نہیں' چوبیس گھنٹوں میں انسان کتنی بار سیاست کے بارے میں سوچتا اور باتیں کرتا ہے۔ سیاست انسان کو بہت عزیز بھی ہے اور وہ اس سے نفرت بھی کرتا ہے۔ اس نے ہماری آنکھوں، کانوں، دماغ اور فکر پر قبضہ جما لیا ہے۔ آج ہم مختلف خطوں کے حریت پسندوں کی تحریک کو زندگی کا اسلوب کہتے ہیں، ان کی جدوجہد کو زندگی کا انداز سمجھتے ہیں' ہر شہر' ہر محلہ' ہر گلی اور ہر انسان کے اندر جو جدوجہد ہو رہی ہے' وہ دراصل زندگی کے اسلوب کو نت نئے معنی عطا کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں آج کی کہانی کے لئے سیاست سے اہم اور کون سا موضوع ہو سکتا ہے؟

انسان کا مطالعہ اور زندگی کا مشاہدہ کہانی کار کی ایک اہم ضرورت ہے۔ متاثر ہونا ایک فطری عمل ہے، لیکن متاثر ہو کر لکھنا کوئی ضروری نہیں۔ وہ تو اندر کی ایک مشین ہوتی ہے، جس پر ضرب پڑے بغیر لکھنے پر آمادہ ہونا کہانی کار کے بس کی بات نہیں۔ گویا کہانی' کہانی کار نہیں بلکہ مشین لکھتی ہے۔ عجیب و غریب مشین ہوتی ہے یہ بھی، بے حد حساس اور نرم۔ وہ دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتی ہے، دوسروں کا دکھ اسے اپنا دکھ لگتا ہے۔ جب کسی دلہن کے جلنے کی خبر آتی ہے تو اس میں سے چنگاریاں سی اڑنے لگتی ہیں، ظلم کی کراہ سنتی ہے تو بلبلا اٹھتی ہے۔ ہزاروں کلو میٹر دور کا دکھ اس کے اندر پہنچ کر ڈنک مارنے لگتا ہے، بے چینی سے وہ کلبلا اٹھتی ہے۔

سب کچھ ہوتا ہے، بہت کچھ ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں ہوتا کہ آنسو، غصہ، نفرت، بے چینی، دکھ، بے کلی کسی کہانی میں بھی ڈھل جائیں۔ جب کہانی ہوتی ہے تو سامنے کا کوئی واقعہ نہیں ہوتا، کوئی منظر نہیں ہوتا، پہلے سے سوچی سمجھی کوئی اسکیم نہیں ہوتی، بس مشین اور کہانی کے درمیان ایک مضبوط رشتہ ہوتا ہے، جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آج کا کہانی کار نہ آپ کی سنتا ہے نہ میری۔ وہ بس مشین کی سنتا ہے۔

کہانی کی بے چارگی یہ ہے کہ آج کوئی نہیں جو اس کی حمایت یا دفاع میں اٹھ کھڑا ہو۔ کہانی اس لئے لکھی جا رہی ہے کہ انھیں چھپنا ہے اور اس لئے چھپنا ہے کہ لکھنے والے کو مشہور ہونا ہے۔ لکھنے والے کو صورتِ حال کی خبر نہیں۔ اسے شعور سے کوئی علاقہ نہیں اور وہ بڑے طمطراق سے داخلی اور خارجی کیفیت کو

بیان کر رہا ہے، اب آپ اسے سنئے، لکھئے، سمجھئے، ناکام رہیے تو اپنا سر دھنئے۔

ترقی پسندی نے اردو کو بہترین افسانے دیے۔ دراصل ان افسانہ نگاروں کا تعلق عوام اور ان کے مسائل سے تھا۔ ان کے پیچھے وراثت کا جو سرمایہ تھا، اس کی اہمیت سے وہ واقف تھے۔ ایک عظیم عوامی تحریک کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آج ہم میں کتنے ایسے ہیں جو اپنے آس پاس سے باخبر ہیں...........؟ اور کتنے ایسے ہیں جو اپنے آپ کو جاننے کی فکر بھی کرتے ہیں.....؟

بگڑنا آسان ہے لیکن واقعی کسی بڑے تجربے کے لئے آمادہ ہونا بہت مشکل۔ ساری کوشش بس اس بات کی ہے کہ جو اچھا برا لکھا گیا ہے، اسے کسی طرح شاہکار تسلیم کرلیا جائے۔ مضامین، تجزیے، ذکرو تذکرہ وغیرہ وغیرہ..........سوال یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو برا کہہ ہی دے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ زمانے کی نبض پر حساس انگلیاں رکھی ہیں اور وقت کسی کی پیروی نہیں کرتا۔

صورت حال خاصی مایوس کن ہے۔ اگر کہانیاں صرف مشہور ہونے کے لئے لکھی جاتی رہیں تو ان میں تجربے کی جو موہوم سی گنجائش باقی رہ گئی ہے وہ بھی نہیں بچے گی۔ ایسے میں اگر کوئی کہتا ہے کہ افسانے میں کوئی بڑا تجربہ نہیں کیا جاسکتا تو اس کا کیا جواب ہے ہمارے پاس..........؟

کیرالہ میں اردو کا ارتقا

کے۔پی۔شمس الدین (تروکاڈو۔بھارت)

کسی زمانے میں جنوبی ہند اردو کا گہوارہ تھا۔آج بھی ہے۔لیکن شمالی ہند کے مقابلے میں ہمیشہ جنوبی ہند کا نام کم لیا جاتا ہے۔جنوبی ہند میں اردو کے تعلق سے آج بھی کئی ایسے موضوع ہیں جن پر گہرائی سے تحقیقی کام ہونا چاہئے۔جنوبی ہند میں کیرالہ ایک ایسی ریاست ہے جہاں کسی کی بول چال کی زبان یا مادری زبان اردو نہیں ہے۔کیرالہ میں ہندو، مسلم اور یہودی سبھی کی زبان ملیالم ہے۔پھر بھی یہاں اردو کا بول بالا ہے۔

کیرالہ میں اردو کا ارتقا ۱۴ویں صدی سے ہوتا ہے۔اسی صدی کے دوران جنوبی ہند میں خلجی حکمرانوں کی آمد کے وقت درباری زبان فارسی تھی۔عام لوگوں کی بول چال کی زبان پروٹو اردو تھی۔جسے زبانِ دہلوی یا ہندوی بھی کہا جاتا تھا۔اسی زبان میں امیر خسرو نے اپنا کلام بھی پیش کیا تھا۔۱۳۱۰ء میں علاء الدین خلجی کیلئے دورِ حکومت میں، کیرالہ کے ملیبار، کوچی، تروانکور صوبوں میں دکنیوں کی آمد ہوئی۔جن کی زبان اردو یعنی دکنی تھی۔

دکن کی بہمنی سلطنت اور ترانکو کے راجاؤں کے درمیان بہت اچھے اور گہرے مراسم تھے۔اس طرح فوجی میل جول کے ساتھ بھی اردو پھیلی۔۱۳۲۵ء میں محمد شاہ تغلق کی حکومت سے بھی ملیبار میں اردو پھیلنے لگی۔اور اردو الفاظ آہستہ آہستہ یہاں کی زبان میں شامل ہونے لگے۔ہندوستان میں پرتگالیوں کی آمد بھی سب سے پہلے کیرالہ کے ساحلی علاقے کالی کٹ میں ہوئی۔۱۵۳۰ء میں پرتگالیوں نے چالیام کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔۱۵۷۱ء میں سامودری راجہ نے اس قلعہ کو فتح کیا تھا۔سامودری راجہ اس قلعہ کو فتح کرنے کیلئے بے جاپور کے عادل شاہی سلطنت سے مدد کی درخواست کی تھی۔عادل شاہی فوج نے یہاں آکر سامودری راجہ کے بحری بیڑے کے امیر البحر کنجالی سرکار (کنج علی سرکار) اور ساتھیوں سے ملکر جنگ لڑی اور قلعہ پر فتح پائی۔ملیبار آئے ہوئے عادل شاہی سپاہی یہیں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے۔جنگی بول

چال کی زبان اردو تھی۔ جس کی بدولت اس زبان کے الفاظ ملیالم زبان میں شامل ہوتے گئے۔اور آج بھی ملیالم میں اردو کے الفاظ کثیر تعداد میں شامل ہوتے جارہے ہیں۔ جنوبی ہند کے آرکاٹ نوابوں کی اردو خدمات سے اہلِ علم واقف ہیں۔آرکاٹ کے نوابوں نے قابلِ تعریف حد تک اردو زبان کی ترقی اور ترویج کی اور اس زبان میں بہت سارے کارنامے انجام دیئے۔جن کا ذکر ''خوانوادہ قاضی بدرالدولہ'' مصنف مولانا یوسف کوکن، ''مدراس میں اردو کی نشوونما'' مصنف ڈاکٹر افضل الدین اقبال اور ''تمل ناڈو کے مشاہیر ادب'' مصنف علیم صبا نویدی میں موجود ہے۔ان نوابوں اور تروانکور کے راجاؤں میں بہت گہرے تعلقات تھے۔اس رشتے کی بنا پر آرکاٹ سے کئی ارداں لوگ تروانکور میں آکر کرنے لگے۔ان میں سے بہت س لوگ راجہ کی فوج میں شامل ہوئے اور ان لوگوں کی بنائی ہوئی مسجد کو ''پالیم مسجد'' کہتے ہیں۔

۱۷۶۰ء میں تروانکور کے چند اختیارات آرکاٹ کے نواب محمد علی کے ذمے تھے۔تروا کور کے راجہ نے نواب محمد علی کے ذریعہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنی دوستی بڑھائی۔جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی آہستہ آہستہ دھوکے سے ہندوستان کو اپنے قبضے میں لے رہی تھی۔عام لوگوں سے تعلقات قائم کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اردو زبان سکھانے کا بھی کام شروع کیا۔جنوبی ہند میں مدراس (چنئی) اس کا مرکز تھا اور کیرالہ کا تمام سرکاری کام کاج مدراس ہی میں ہوتا تھا۔

۱۷۵۷ء میں کالی کٹ کے راجہ سامودری نے پالگھاٹ کے حکمراں سروپ پر حملہ کا۔یہاں کے اتی کومی اچھن نے میسور کے گورنر حیدر علی سے مدد مانگی تو پہلی بار میسور کی فوج ملیبار پہنچی۔جن کی مادری زبا بھی اردو تھی۔ایک معاہدے کے مطابق مسئلے کا حل نکالا گیا۔لیکن سامودر معاہدے سے پیچھے ہٹ گیا۔جس کی بنا پر ۱۷۶۶ء میں حیدر علی نے ملیبار پر فوج کشی کر کے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔۱۷۷۳ء میں اپنی حکومت قائم کی۔یہیں سے کیرالہ میں اردو چاروں طرف تیزی سے پھیلتی گئی۔ملیبار آئے ہوئے فوجی اپنے خاندان سمیت یہیں بس گئے۔بہت سے لوگوں نے شادی بیاہ کر کے یہیں گھر بسا لیے۔جن کی زبان کا اثر ملیالم زبان پر کافی حد تک پڑا۔

حیدر علی کے بعد ٹیپو سلطان ملیبار کے حاکم بنے۔ٹیپو کے دور میں انگریزوں کے ساتھ مل کر چھوٹے موٹے راجاؤں نے سرکشی شروع کردی۔ٹیپو نے انگریزوں کو اور ان کے ساتھ دینے

والوں کو کچل کر رکھ دیا۔ٹیپو سلطان اپنی فوج کے لئے ایک ہفتہ وار "فوجی اخبار" اردو میں شائع کیا کرتے تھے۔جس میں جنگی طریقے اور حوصلہ افزا مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔یہ اخبار کیرالہ کے فوجی کے ہاتھوں سے بھی گزرتا تھا۔اردو میں شائع ہونے والے سلطان کا فرمان بھی کیرالہ بہ آسانی پہنچ جاتا تھا۔ٹیپو سلطان کالی کٹ سے ہٹ کر ملیبار میں ایک مرکز قائم کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ انھوں نے کالی کٹ کے ساحلی علاقے پر اپنی فوج اور عام لوگوں کو بسنے پر آمادہ کیا۔یہاں ایک قلعہ بھی انھوں نے تعمیر کیا۔جس کا نام "فرخ آباد" رکھا۔جسے آج بھی "فروک" کے نام سے جانا جاتا ہے۔لوگوں پر نظر رکھنے کے علاوہ جنگ کی ذمہ داری یہاں سید شاہ منگل کو سونپی گئی تھی۔جو ممبئی کے نزدیک واقع ایک مقام "کلیان" سے آئے تھے۔

جمال و کمال

صبا اکبرآبادی

وہم ِ رنگ ِ جمال ہے شاید
ایک نقش ِ خیال ہے شاید
ہو رہے ہیں خفا دو عالم سے
ہمیں ان سے ملال ہے شاید
اس جراحت کدے میں دنیا کے
مسکرانا کمال ہے شاید
آگہی ہے عروج پر دنیا
اب شروع ِ زوال ہے شاید
بے طلب مل رہی ہے دولت ِ غم
میری صورت سوال ہے شاید
حد امکان ِ شوق ختم ہوئی
تجھ سے ملنا محال ہے شاید
درد میں لطف آرہا ہے صبا
ان کو دل کا خیال ہے شاید

اقبال سحر انبالوی

۴۱۷-بی، تاجپورہ ہاؤسنگ اسکیم لاہور-۵۴۸۷۰

زمیں پہ ہم کو اتارا تو گھر بھی دینا تھا
سفر کی راہ میں کوئی شجر بھی دینا تھا
ہمارے خواب کو جو ڈھالتا حقیقت میں
کسی کے ہاتھ میں ایسا ہنر بھی دینا تھا
غم ِ زمانہ کا ہر وار ہنس کے سہ لیتے
ہمیں وہ حوصلے والا جگر بھی دینا تھا
پہنچتے کیوں نہ سر ِ منزل ِ تمنا ہم
ہمارے ساتھ کوئی راہبر بھی دینا تھا
میں جس سے دیکھتا اپنے تمام عیب و ہنر
مری نظر کو وہ نور ِ بصر بھی دینا تھا
مری صدا پہ وہ رک جاتا دو گھڑی کے لئے
مری زبان میں اتنا اثر بھی دینا تھا
فقیر مجھ کو بنا تو دیا ہے تو نے مگر
فقیر جیسا مجھے کر و فر بھی دینا تھا
تیری یہ عنایت یہ عطا یاد رہے گی

☆

کرامت بخاری۔اے۔۷۔۲۸۷۔جی او
آر وی۔فیصل ٹاؤن، لاہور

کیف ِ الفت سے سرشار آنکھیں
ہم نے دیکھی ہیں تلوار آنکھیں
قافلہ ہو جہاں اہل دل کا
اس کی ہوتی ہیں سالار آنکھیں
آنکھ سے بڑھ کے دل ان کا حامی
دل سے بڑھ کے طرفدار آنکھیں
ہونٹ انکار کرتے ہیں جس کا
اس کا کرتی ہیں اقرار آنکھیں
جب زباں پہ ہو ظلمت کا پہرہ
بات کرتی ہیں بیدار آنکھیں
رات بھر جو گزرتی ہے ،ہم پہ
وہ بتائیں گی بیمار آنکھیں
آپ آنے کا وعدہ تو کیجے
ہم بچھائیں گے سرکار آنکھیں

سجاد مرزا
(۲۔گوبندگڑھ۔گجرانوالہ۔پاکستان۔)

نشاط آمیز کیفیت خیال و خواب لگتی ہے
کسی بھولی کہانی کا سنہرا باب لگتی ہے
رویہ اس کا ہم سے ہے خلوص آمیز سا ایسے
کسی شمشیر کو جیسے وفا کی آب لگتی ہے
تبسم ریز لہجے میں وہ ہوتا ہے مخاطب جب
طبیعت اس گھڑی اپنی بڑی بے تاب لگتی ہے
کبھی تو بے ارادہ بھی ہمارے گھر وہ آئے گا
یہ خواہش ہے فقط خواہش ،ہمیں جو خواب لگتی ہے
اسے اپنے کئے پر کیوں ندامت ہو کہ وہ اکثر
وفا کا ورد کرتا ہے،وفا کمیاب لگتی ہے
اسے سجاد مرزا بھولنا چاہوں تو ناممکن
کہ وہ صورت ، مجھے تو صورت مہتاب لگتی ہے

حسیر نوری۔ بی۔۱۱۱، مصطفےٰ آباد، ملیر سٹی۔ کراچی ۷۵۰۵۰

صبح سے تا شام سورج کی طرح جلتے رہو
گمشدہ لمحوں کا اپنے جائزہ لیتے رہو

اپنے قدموں کے نشاں ڈھونڈو کہیں مل جائیں گے
شہر کی آباد سڑکوں پر یونہی چلتے رہو

چیختے لمحوں کا موسم حادثوں کا ہے سبب
اپنی دہلیزوں پہ مت تم دیر تک بیٹھے رہو

اپنی بربادی کا خود ہی بن گئے ہو تم جواز
سب کی نظروں میں ہمیشہ کی طرح اچھے رہو

دشمنِ جانی کو تم اپنے دعائیں دو سدا
جس قدر ممکن ہے تم کارِ وفا کرتے رہو

دھوپ دیواروں سے اترے گی یقیناً ایک دن
اپنے ہی سائے سے جب تک ہو سکے لپٹے رہو

دوستوں کی سوچ کا انداز ہے بدلا ہوا
بے ریائی کی جھلک پاؤ تو پھر ملتے رہو

تم کو تو ان کی رفاقت بھی میسر ہے حسیر
ان کے دامانِ محبت کو سدا پکڑے رہو

☆

فراغ روہوی

ندی کبھی نہ کبھی تو ابل ہی جائے گی
مگر یہ بات کناروں کو کھل ہی جائے گی

ہر ایک شمع کو آندھی بجھا نہیں سکتی
جسے ہواؤں میں جلنا ہے جل ہی جائے گی

ابھی تو تخت نشیں ہے سیاہ رات مگر
یہ طے ہے اس کی حکومت بدل ہی جائے گی

نہ آئی صبحِ مسرت یہ دکھ نہیں مجھ کو
ملال ہے کہ شبِ غم بھی ڈھل ہی جائے گی

یہ رُت بھی ریت کی مانند اپنی مٹھی سے
میں جانتا ہوں پھسل کر نکل ہی جائے گی

فراغ دامنِ امید چھوڑنا نہ کبھی
مصیبتوں کی یہ ساعت بھی ٹل ہی جائے گی

ضیا ندیم۔ کراچی

ہم تو ساحل ہیں سمندر ہو تم
ہم پس پشت ہیں منظر ہو تم

آنکھ میں خواب کی صورت ہو نہاں
اپنی ہر فکر کا محور ہو تم

ہم نگیں ہو کے بھی بے قیمت ہیں
جو ہو انمول وہ پتھر ہو تم

بھول جاؤں تمہیں ممکن ہی نہیں
دل تو کیا روح کے اندر ہو تم

جو نگاہوں میں اتر جائے ضیاء
رنگ و نکہت کو وہ پیکر ہو تم

اسحاق ساجد۔ جرمنی

گھر سے آئی ہے ہوا پر دیس میں
ہے وطن جیسی فضا پردیس میں

جا گزیں ہے روح کی گہرائی میں
تجھ کو میں کیا ڈھونڈتا پر دیس میں

یوں رواں ہیں شہر میں اہلِ ہوس
جیسے بستا ہو خدا پر دیس میں

فاصلوں کی خامشی کو توڑ کر
کس کی آتی ہے صدا پر دیس میں

ایک ہی تھا آشنا ساجد مرا
وہ بھی جا کر بس گیا پر دیس میں

اسلوب و بیان

کرن کرن/ جوگندر پال (بھارت)

''ارے، جواب کیوں نہیں دیتے، چاند؟''

''بولو!''

''میری طرف ٹکر ٹکر کیا دیکھنے لگے ہو۔؟ کرن اپنی بات کہنا بھول گئی تھی۔''

''تمہیں!''

''نہیں، تم مجھے وہ نہیں سمجھتے جو میں ہوں۔'' اپنی ہی کوئی کلپنا سمجھتے ہو۔''

''میری کلپنا؟ کلپنا تو تمہاری بہن ہے۔''

''ہاں ہاں بابا' بہن ہے میری وہ کلپنا، لیکن میں تمہاری کہانی کی کلپنا کی بات کر رہی ہوں، جو تم سے جی بھر کے باتیں بھی کرنے نہیں دیتی۔''

''لو اب جی بھر کے باتیں کرو'' چاند نے کاغذ کے اوراق ایک طرف ڈال دیئے، لیکن قلم اسی طرح اس کے ہاتھ میں تھا۔

جب سے چاند کی شادی ہوئی تھی، اسے کہانی پھیکی معلوم ہونے لگی تھی۔

''میں کئی بار سوچتی ہوں چاند! رائٹر انسان نہیں ہوتا۔ بس رائٹر ہوتا ہے۔''

چاند نے محسوس کیا اس کی بیوی نے کہا ہے، ''بس جانور ہوتا ہے۔۔۔ جانور۔''

''ہاں اور کیا؟ تمہارے ساتھ کہیں جا رہی ہوتی ہوں تو یہی لگتا ہے، کسی بن مانس کے ساتھ چل رہی ہوں۔۔۔ دیکھو لوگو! میرا یہ کہانی کار، آدمی کے لباس میں بالکل آدمی معلوم ہوتا ہے، آدمیوں کی طرح باتیں بھی کر لیتا ہے' بلکہ آدمیوں سے بھی اچھی باتیں کرتا ہے۔۔۔''

کرن سے اپنی قسمت جوڑ کر چاند کو معلوم ہوا کہ وہ بہت خوش قسمت ہے۔ جینے کی فطری خواہش کے مقابلے میں سب دوسری خواہشیں ادنیٰ ہیں۔ جن کے جسم سالم ہوتے ہیں وہ جی جی کر جیتے ہیں۔ اور جو اپاہج ہوتے ہیں وہ لکھ لکھ کر، یا رو رو کر!۔۔۔ بابا تمہاری کہانی پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔۔۔ یہ لو چار آنے!

چاند کے ساتھ یہ معجزہ ہوا کہ کرن سے شادی کر کے اس کے ٹوٹے پھوٹے ہاتھ پیر از سر نو پنپنے لگے اور جینے کی خواہش اس کے وجود میں نئے خون کی طرح بھرنے لگی، اب وہ بہت کم لکھتا تھا۔ اور جب لکھتا تھا، موٹی موٹی باتیں لکھتا تھا۔ اور موٹی باتیں لکھ لکھ کر اسے پہلی بار پتہ چلا تھا کہ موٹی باتیں کتنی گہری ہوتی ہیں۔

''کرن! میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔'' میں تم سے محبت کرتا ہوں کرن! ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔ بہت محبت کرتا ہوں کرن!''

جیسے محبت کی کوئی گنجلک تعریف کر کے وہ محبت کے معنی میں خلل پیدا کر دے گا۔ محبت کا سارا معنی، اسی ایک لفظ محبت سے ہی تو ادا ہو جاتا ہے۔

چاند کو اپنی بیوی سے اتنی محبت تھی کہ اس کی پالتو بلی لیڈی کو دیکھ کر بھی اس کا جی چاہتا کہ اسے گلے لگا لے۔

''او لیڈی! ۔۔۔ او مائی لیڈیز لیڈی! ۔۔۔ مائی سویٹ ۔۔۔'' اور لیڈی بے حد محبوبانہ آواز میں جواب دیتی، میا ۔۔ ؤں! ۔۔ ں!

میاؤں!

ایک لیڈی سے ہی نہیں، چاند کو کرن کی بہن کلپنا سے بھی محبت تھی۔ کیوں کہ کرن کلپنا کو بے حد چاہتی تھی۔

''آج پھر میکے چلی گئیں کرن۔'' کرن کے ماں باپ اسی شہر میں چند گلیاں پرے رہتے تھے۔

''ہاں کیا کروں چاند؟ اپنے کلو کے بغیر اداس ہو جاتی ہوں۔''

''ہاں کرن، تمہاری بہن میں نہ جانے کیا جادو ہے۔ میں بھی اس سے ملتا ہوں تو ۔۔'' چاند نے سوچا کرن اور کلپنا، سندرتا اور سوچ یک قالب ہوتیں تو ۔۔ تو ۔۔

''کلو ہماری بہت پیاری ہے چاند ۔۔۔ ہے نا؟''

''ہاں، تمہاری اتنی پیاری بہن ہے تو میری بھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' مگر اسے کلپنا کو بہن کہنا اچھا نہ معلوم ہو رہا تھا۔

''ہاں، ہاں کہو، کلپنا تمہاری کیا ہوتی ہے؟''

''جو تم ہو!'' وہ گھبرا سا گیا، میرا مطلب ہے، بلی یا بہن، یا جو کچھ بھی۔'

کرن ہنسنے لگی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' کرشن کنہیا بھی تو۔۔۔'' نہ جانے اپنے آپ کو کیا بتانے کے لئے اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تم سب کچھ کر لیتے ہو میرے کرشن کنہیا، پر ایک مرلی بجانا نہیں جانتے۔''

''تم اور تمہاری بلی اور۔۔۔ تمہاری بہن میری مرلی سے رام ہو جائیں تو میں کرشن سے بھی اچھی مرلی بجالوں، لیکن سچ بتاؤ، تمہیں بلے کی خرخر زیادہ مدھر معلوم ہوتی ہے یا مرلی کی تان؟''

کرن اپنے کام کاج سے ذرا رسوئی میں چلی گئی تھی، پلٹ کر آئی تو چاند کو پھر اپنی کہانی پر جھکا پایا۔

سب کچھ تج کر تم اپنی جھوٹی سچی کہانیوں پر جھکے رہتے ہو۔ میں چاہتی ہوں، میں بھی کہانی بن جاؤں اور تمہارے قلم کی نوک سے حرف حرف بہتی رہوں۔''

''تو پھر کیا ہوگا؟''

''پھر تمہاری ہر کہانی سچی ہوگی۔ سچی کہانیوں کے ایک ایک لفظ میں لکھنے والے کا محبوب چھپا ہوتا ہے۔ اس کے قلم کی نوک جیسے کرن کے بدن سے چبھ چبھ کر گزر جاتی ہو۔''

''نا بابا' سچ بول کر میں تمہیں اذیت کیوں پہنچاؤں؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا' آج تم کلپنا کے گھر سے اتنی دیر سے کیوں لوٹی؟'' چاند سسرال کو کلپنا کا گھر ہی کہا کرتا تھا۔

''کیوں کہ کلپنا کے گھر والے کلپنا کو گھر سے اٹھانے کی سوچ رہے ہیں۔۔۔ ٹھہرو! میں چائے لے کے آتی ہوں' پھر باتیں کریں گے۔'' وہ اٹھ کر دروازے کی طرف مڑ گئی۔

کرن کی پشت پر نظر جما کر چاند کو اپنی بیوی پر کلپنا کا دھوکہ ہونے لگتا۔۔ دونوں بہنوں کی عقبی ساخت کتنی یکساں ہے! سفید گردن سے پھسل پھسل کر بالائی پشت اور کمر سے نیچے ہی نیچے جاتی ہوئی موٹی موٹی کالی چوٹی گھٹنوں پر پہنچ کر زمین پر گرنے سے بچنے کے لئے پھر اوپر کو دوڑ آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے بدحواسی میں بندھی بندھی کھل رہی ہے۔

ایک بار چاند نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔''تم میری طرف پیٹھ موڑ لیتی ہو تو بالکل کلپنا ہی معلوم ہوتی ہو۔''

"تو میں تمہاری طرف منہ ہی کر کے آگے پیچھے چلا کروں گی۔" اس کی بیوی نے ہنس کر جواب دیا تھا۔

"ہاں کرن، مجھے یقین ہے تم میری طرف سے کبھی منہ نہ موڑو گی۔"

چاند کرن کا منہ دیکھ کر، بے قابو ہو کر اسے گلے لگا لینا چاہتا، مگر وہ ذرا اپنی پیٹھ اسی طرف موڑ لیتی تو اس کے ذہن میں کلپنا آسماتی۔

"اری۔۔۔۔ی۔۔۔کلو!۔۔۔کلو!

"لو میں چائے لے آئی۔" کمرے میں داخل ہوتی ہوئی کرن کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ چاند بے قراری سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھ آیا۔

"باؤلے کیوں ہو رہے ہو چاند؟۔۔ار۔۔۔ر۔۔۔! چائے کا ٹرے الٹ جائے گا۔ چلو بیٹھو۔"

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ کرن خالی پیالیوں کو گرم اور سرخ قہوے سے بھرنے لگی۔

"جانتے ہو؟ آج میں نے کلپنا سے پوچھا، بتاؤ کلو تمہارے لئے کیسا پتی ڈھونڈیں؟" چاند نے گرم گرم سرخی کی افراط سے سیاہ ہوتے ہوئے قہوے سے نظر ہٹا کر اپنی بیوی کی بات سننے کے لئے کان کھڑے کر لئے۔

"کلو نے جواب دیا، چاند جیجا جی جیسا!"

"مجھ جیسا؟" وہ کرن کی پشت پر نظر باندھے ہوئے تھا۔ "ہاں، ماں جی نے تین چار لڑکوں کی تصویریں دکھائیں مگر اسے کوئی پسند نہ آیا۔۔۔اور جانتے ہو؟۔۔۔میں کلو سے وعدہ کر آئی ہوں، اس کے لئے تم جیسا ور ڈھونڈ کر ہی دم لوں گی۔"

"مگر کرن۔۔۔" چاند رک گیا، پھر بھی اس کے منہ سے نکل ہی گیا۔ "اپنے جیسا تو صرف میں ہی ہوں۔"

"اسی لئے تو میں نے بلا جھجک تم سے شادی کر لی۔" اس نے چائے پینے کے لئے چاند کا جھوٹا کپ اٹھا لیا۔

"تمہارے سوا تم جیسا اور کون ہو سکتا ہے ڈارلنگ؟"

چاند بھی کلپنا کے لئے کوئی مناسب لڑکا تلاش کرنے لگا۔ "چاند جیجا جی جیسا!"

''تو کیا کلپنا کے لئے میں اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ہوں؟ وہ۔۔۔ بالائی پشت سے کلو کی، نہیں کرن۔۔۔ یا شاید کلو ہی کی چوٹی پھسل پھسل کر نیچے ہی نیچے چلی آرہی ہے۔ بدحواس ہو ہو کے بندھی بندھی کھلی جارہی ہے۔

''میں نے کہا۔۔۔ کلو۔۔۔!''

''ہاں؟''

''تم کرن؟ مجھے لگا' کلو ہے!''

''میں کلو ہی ہوں!''

'اوہ!۔۔ 'مجھے لگا کرن ہے!۔۔۔ اری مجھ میں کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے جو تمہیں میرے جیسا ہی پتی چاہئے' یا شاید تم میری بجائے میری جھوٹ موٹ کی کہانیوں پر ریجھ گئی ہو۔''

''جھوٹ موٹ کی کہانیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں، چاند جیجا جی۔''

''یہ میری طرف پاگلوں کی طرح گھر گھر کر کیا دیکھ رہے ہو چاند؟۔۔۔ چا۔۔۔ ند۔۔؟

''ک۔۔۔ کون؟۔۔۔ کرن!۔۔' تمہیں دیکھتے ہوئے تمہارا چہرہ میری آنکھوں سے کیوں اوجھل ہو جاتا ہے؟

''پگلا!۔۔ وہ دیکھو۔۔۔ وہ کون آرہی ہے؟۔۔۔ کلپنا۔۔۔ آؤ کلو!''

کرن اور کلپنا کی بے چین باہیں ایک دوسرے کو جکڑ لینے کے لئے ہوا میں کوند پڑیں۔۔۔ یہ کس کی پیٹھ ہے؟ کس کا چہرہ ہے؟

چاند ہر رات حسب معمول نکلتا رہا اور کرن کرن سینے سے لگائے اپنی خوابیدہ وارفتگی سے چمکتا رہا۔ لیکن پچھلی اماوس کو اس کالی کلوٹی رات کو وہ ساری کائنات سے لاپتہ تھا۔ شاید اپنی ذات کی تلاش میں کہیں بھٹک رہا تھا کہ ضدی کلپنا کے لئے اپنے جیسا کوئی پتی ڈھونڈ نکالے۔

کرن کو اچانک شدید ہیضے نے آلیا تھا اور صرف کلپنا اس کی تیمارداری میں جاگ رہی تھی اور تارے گن رہی تھی۔ ان گنت، بے چین، چھوٹے چھوٹے، جن کی کرن اتنی مدہم اور شکستہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا اب گئی۔۔۔ اب گئی۔

''پانی۔۔۔ی!'' کرن نے قے کرنے کے انداز میں بمشکل کہا۔

''یہ لو!'' کلپنا نے پانی کا بھرا ہوا گلاس کرن کے منہ سے لگا دیا۔۔ ''تھوڑا پیو، کرن۔''

''غٹ۔۔غٹ۔۔غ۔۔!

کرن پانی میں ڈوب ڈوب کر بھی خشک تھی۔ ''اور!۔۔اور دو!''

''ہاں !۔۔لو !'' کلپنا کی ایک آنکھ میں گھٹا اتری ہوئی تھی اور ایک میں چاند نکلا ہوا تھا، وہ سوچ رہی تھی، میری بہن مر گئی تو کیا ہوگا۔۔۔؟ اس نے ایک بار پھر کرن سے کہا۔

''تھوڑا پیو کرن۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔'' لیکن کرن بے تابی کے عالم میں بڑے بڑے گھونٹ بھر رہی تھی اور گویا اپنے پیٹ میں ڈوبتے ہوئے بے بسی سے ہاتھ پیر مارے جا رہی تھی۔ اور کلپنا کی ایک آنکھ میں گھٹا اور کالی ہوتی گئی اور دوسری میں چاند اور چمکیلا۔ وہ اتنی غمگین تھی کہ اسے پتہ ہی نہ چل پا رہا تھا کہ وہ کتنی خوش ہے۔

چاند تار ملتے ہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ آیا۔

''یہ کیسے ہو گیا؟ تم نے کرن کو کیوں مرنے دیا کلو؟''

''ہاں میں نے ہی اسے مرنے دیا۔ میں چاہتی تھی کہ۔۔۔کہ۔۔۔نہیں! میں یہ تو نہیں چاہتی تھی۔ کلپنا گم سم پڑی سوچتی رہی کہ وہ کیا چاہتی تھی۔

کرن کی موت کے تین چار ماہ بعد کلپنا کی ماں نے اس سے کہا۔ ''بیٹی، ہم تمہاری شادی چاند سے کرنا چاہتے ہیں۔''

''نہیں!۔۔نہ۔۔نہ ماں!'' کلپنا نے گھبرا کر جواب دیا۔ اس کی ماں اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔۔ ''کیوں؟''

''بس کہہ جو دیا، نہیں!''

(چاند جیجاجی جیسا)

''چاند میں کیا کمی ہے بیٹی کلو، تم ہاں کہہ دو گی تو ہمارا چاند ہمارا اپنا بنا رہے گا۔'' ماں ٹوٹے ہوئے دھاگے کو ایک طرف پھینک کر دوسرے دھاگے کو سوئی میں ڈالنے لگی۔

"نہیں ماں مجھے ساری زندگی شادی نہیں کرنا ہے۔۔میں۔۔۔میں"

چاند بے کرن ہو جائے تو کلپنائیں کنواری رہ جاتی ہیں۔

جب چاند کو معلوم ہوا کہ کلپنا نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے اسے بہت غصہ آیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے من کے چور کو باہر دھکیل کر خوب پیٹے۔چور۔۔! کمینے۔۔! ڈھونگی۔۔۔! اور اس کے من کا چور اس کا ارادہ بھانپ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

چاند کے سر میں کرن کا شہر چھوڑ دینے کی اتنی دھن سماگئی کہ نوکری کے تبادلے کی کوشش میں اپنا غم بھی بھول سا گیا۔آخر اس کے تبادلے کے آرڈر آگئے۔اسے دور دکن میں جانا تھا۔نہ جانے وہ جگہ کیسی ہوگی، وہاں کیوں کر گزر ہوگی، کس سے واسطہ پڑے گا۔لیکن جب آدمی مرنے پر تل ہی جائے تو اسے اسی خیال سے راحت ہوتی ہے کہ اس دنیا سے تو اٹھ جاؤں گا۔

چاند کی گاڑی ریلوے اسٹیشن سے جانے والی تھی۔سب لوگ اسے چھوڑنے آئے تھے۔کرن اور کلپنا کے والدین بھی، لیکن کلپنا وہاں نہ تھی۔شاید اس لئے کہ اسے یقین تھا کہ چاند ابھی مرا نہیں۔سدا کے لئے تو مردوں کو چھوڑنے جاتے ہیں یا شاید اس لئے کہ اب چاند مر ہی چکا ہے۔تو اس کا چاند سے کیا واسطہ؟

گاڑی نے وسل دیا، چاند کے کانوں میں مرتے مرتے اپنے عزیزوں کی چیخ پکار سنائی دی۔گاڑی حرکت کرنے لگی۔کاش ان رونے والوں میں کلپنا بھی ہوتی! مرنے والے کے دل میں آخری خواہش پیدا ہوئی۔سفر شروع ہو گیا۔ابھی ابھی وہ یہیں تھا، اب کہاں ہے؟ چلو جو مر گیا سو مر گیا۔بھگوان اسکی آتما کو شانتی دے۔مصیبت تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو پیچھے رہ جاتے ہیں۔مصیبت تو کلپنا کے لئے تھی، وہ اپنی کنواری رہنے کی قسم پر اڑی رہی۔اس طرح کہ اس نے اپنے آپ کو بھی کبھی نہیں چھوا!

کلپنا نے ماہ وسال کے اتنے بڑے ڈھیرے کی ڈھیلی سی گٹھڑی کا بوجھ سر پر لاد لیا۔ماہ وسال اس گٹھڑی سے گر گر کر اس کا بوجھ ہلکا کرتے رہے۔لیکن اسے اپنے بوجھ کا احساس ویسے ہی رہا۔کم نہ ہوا۔

یادیں۔۔۔یادیں۔۔۔! بھوت ہوں یا نہ ہوں، لیکن جس شخص کا آج اس کے بیتے دنوں سے آباد ہو، وہ بھوت ہی ہوتا ہے۔صاف نظر بھی آتا ہے۔اور غائب بھی ہوتا ہے۔کلپنا کی طرف دیکھ کر بھی پتہ نہ

چلتا تھا کہ وہ سامنے ہے یا اوجھل۔

اور پھر ایک دن ایک ادھیڑ عمر آدمی وارد ہو گیا۔

گجر دم کلپنا نے دروازے پر۔۔یا شاید دل پر۔۔۔کھٹکا سا سنا۔اٹھی جیسے کوئی نیند میں چلنے لگا ہو۔اس نے برآمدے میں بتی جلائے بغیر دروازہ کھول دیا۔

"تم؟"

چاند گویا آج ہی صبح گھر گیا ہو۔اور دن بھر کے کام دھندے کے بعد لوٹنے میں اسے اتنی دیر ہو گئی ہو۔کرن سے گلے ملنے کے لئے وہ اس کی طرف بے اختیار بڑھتا چلا گیا۔اور جب وہ ملے تو کرن پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اس کی چھاتی پیٹنے لگی، "اتنی دیر سے کیوں آئے ہو۔"

آنگن سے اپنے بوڑھے باپ کی ہلکی سی کھانسی کی آواز سنائی دی۔وہ دونوں تیزی سے الگ ہو گئے۔

"بیٹی،کون آیا ہے۔؟

کلپنا چاند کا سوٹ کیس پکڑ کر آنگن کے دروازے کی طرف ہو لی۔"وہ آ۔گئے ہیں بابا۔۔آ گئے ہیں:"

کلپنا کی پیٹھ پر نگاہ جما کر چاند نے لمبی لمبی سفید گردن سے پھسل کر کمر سے نیچے ہی نیچے جاتی ہوئی وہی کالی کالی چوٹی دیکھی۔

پیٹھ کرن کی ہے۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔

"آؤنا" کلپنا اس کی طرف مڑ کر مسکرانے لگی۔

اور چہرہ کلو کا۔

صبح امید اقیصر سلیم۔ کراچی

سہانی صبح تھی' موسم بہار کا' سڑکیں خالی' ٹریفک کا شور نہیں کہ ابھی شہر کے تمام لوگ عیدگاہ جانے کی تیاریوں میں تھے۔

جہاں جہاں درخت زیادہ تھے وہاں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ایسے ہی درختوں کے جھنڈ میں ڈاکٹر نجمی کا بنگلہ تھا۔ ڈاکٹر کے دونوں لائق فائق بیٹے اپنے بیڈ روم میں لمبی تان کر سو رہے تھے۔ لائق فائق اس لئے تھے کہ دونوں نے اعلیٰ نمبروں سے گریجویشن کیا ہوا تھا اور مغربی تہذیب میں اس قدر رچ بس گئے تھے کہ اب اردو کو بھی انگریزی لہجے میں اور انگریزی الفاظ کے ساتھ بولتے تھے۔ کھانے کے لئے چھری کانٹے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے بجائے ٹشو پیپر استعمال کرتے تھے۔ ابا اماں پراٹھے کھاتے پکاتے تھے جو انہیں پسند نہیں تھے۔ مٹھائیاں بھی ان کے لئے کشش کا باعث نہیں رہی تھیں۔ آئس کریم کے رسیا تھے۔ باہر فاسٹ فوڈ ریستورانوں میں پیزا' برگر' فرنچ فرائز اور چائنیز وغیرہ ان کے مرغوب کھانے تھے۔ سبزیوں میں لوکی' ٹنڈا' کدو اور ساگ سے تو جیسے چڑ تھی۔ پان کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور اس وقت دونوں لائق فائق بیٹے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ چاند رات دونوں نے باہر گھوم پھر کر گزاری تھی اور صبح کے چار بجے آ کر سوئے تھے۔۔۔ اتنے میں ان کے بیڈ روم کا دروازہ دھڑام سے کھلا اور ڈاکٹر نجمی نے آواز دی۔

''اٹھو' جلدی کرو دیر ہو رہی ہے۔''

بیڈ پر کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ڈاکٹر نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے چلا کر کہا۔

''جلدی کرو''

ایک کی چادر میں حرکت ہوئی۔ اس نے سر باہر نکال کر کہا۔ ''پاپا آپ جائیں۔ میں بعد میں قضا پڑھ لوں گا۔''

''عید کی نماز کی قضا نہیں ہوتی ہے۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

''ابھی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ پھر سو بھی نہیں سکوں گا۔ کیا فائدہ وہاں جا کر اونگھتا رہوں

گا۔"

"چلو۔ ہاتھ منہ دھولو۔ وضو کرلو۔ نیند بھاگ جائے گی۔"

"نہیں پاپا۔ امام صاحب بڑی لمبی دعا مانگتے ہیں۔ وعدہ کرتا ہوں۔ اگلی عید میں آپ سے پہلے عید گاہ پہنچ جاؤں گا۔"

"اگلی عید میں تو تم امریکہ میں ہو گے۔"

"وہاں پڑھ لوں گا۔ وہاں چاندرات نہیں ہوتی ہے۔"

"دیکھو آخری بار کہہ رہا ہوں۔"

"او کے۔ اگر آپ اسی پینٹ شرٹ میں جانے کی اجازت دیں تو چلتا ہوں۔ کلف لگی شلوار قمیض مجھ سے نہیں پہنی جائے گی۔"

"اور تیرا کیا ارادہ ہے چھوٹے؟"

ڈاکٹر نجمی دوسری چادر سے مخاطب ہوئے۔ اس بیٹے نے سر نکال کر کہا۔

"پاپا میرا پیٹ خراب ہے۔ دو بار جا چکا ہوں۔"

"نالائق" ڈاکٹر نجمی نے دونوں لائق فائق بیٹوں کو زور سے کہا اور خود باہر نکل گئے۔

ڈاکٹر نے گاڑی باہر نکالی اور بنگلے سے باہر جانے ہی والے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ سرونٹ کوارٹر سے ان کا ملازم رشید سفید شلوار قمیض میں اپنے چھوٹے بڑے بچوں کو ساتھ لئے عید گاہ کی طرف جا رہا تھا۔

☆......☆

زمین کا وارث / ڈاکٹر عمران مشتاق (رگبی۔ برطانیہ)

فون سننے کے بعد مرزا احساس بیگ کو چپ سی لگ گئی۔ ان کی بے چین نگاہیں تو بیوی اور بچوں کا طواف کر رہی تھیں جن کے کان کوئی خبر، کوئی نئی بات سننے کے منتظر تھے، پر ان کا ذہن کہیں اور تھا۔ سوچوں کا ایک ریلا تھا، جو انھیں اپنے ہی بہاؤ میں لیے جا رہا تھا اور وہ بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتے بہے چلے جاتے اگر ان کی بڑی بیٹی فاطمہ ان کی مدد کو نہ آجاتی۔ اس کی پکار نے بند سا باندھ کے ریلے کا زور توڑ دیا۔ وہ احسان مندی سے بیٹی کی طرف دیکھ کے مغموم انداز میں مسکرائے۔ "ابو کس کا فون تھا"؟ فاطمہ پوچھ رہی تھی اور ساتھ ہی اس کا دل ایک جانے پہچانے دکھ سے بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ ایک اچھی بیٹی تھی۔ باپ سے بہت محبت کرنے والی اور ان کے دکھ درد اور مجبوریوں کا ادراک رکھنے والی۔ گھر میں وہی تو تھی جو جانتی تھی کہ قابو میں نہ آنے والے حالات اور ماں کی بدزبانی نے ان کو وقت سے پہلے بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچا دیا تھا۔ بالوں میں سفیدی اور چہرے پر لکیروں نے اتنی تیزی سے قبضہ جمایا تھا کہ وہ وقت کے آگے ہارسے گئے تھے۔ اسے اپنے تہی دامن بوڑھے باپ پر بے طرح ترس آتا، وہ ان کی محرومیوں کا مداوا تو نہ کر پاتی پر تسلی اور ڈھارس کا مرہم ضرور رکھنے کی کوشش کرتی۔ اور ان کے لئے اپنے گھر کے لئے بہت سی دعائیں کرتی رہتی۔

"ایک دوست کا.......... امریکہ سے۔" وہ اتنے مدھم لہجے میں بولے کہ پاس بیٹھی فاطمہ کے سوا شاید ہی کوئی اور سن پایا ہو۔

"یقیناً انکل ریاض شیخ کا فون ہوگا۔" اس نے اندازے سے کہا اور مرزا صاحب کی آنکھوں نے فاطمہ کے اندازے پر صاد کیا۔

بھری دنیا میں انکل ریاض شیخ ہی تو ان کے ایک دوست تھے جو برسوں پہلے امریکہ جا بسے تھے۔ کبھی کبھار کوئی خط یا فون آجاتا مگر وہ خود کبھی نہیں آئے۔ فاطمہ کو اندازے سے زیادہ تو یقین تھا کہ فون انکل ریاض کا ہی ہوگا۔ مگر جس بات نے اس کا دل دہلا دیا، وہ اس کے باپ کا رویہ تھا۔ جب بھی ان کے دوست کا فون آتا تو وہ کھل اٹھتے، کئی دنوں تک اس چند منٹ کی مختصری فون کال ذکر ہوتا رہتا۔ فون کال تو تمہید بن جاتی اور وہ ان خوشگوار دنوں کی یاد میں کھو جاتے جن کی اب صرف پرچھائیاں ہی باقی رہ گئی

تھیں۔

''ابو انکل ریاض کیا کہہ رہے تھے۔'' ان کے بڑے بیٹے مجتبیٰ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ وہ بی۔کام۔کر کے فارغ پھر رہا تھا۔ اکثر باپ پر زور دیتا کہ اپنے دوست سے کہیں کہ اسے امریکہ بلوالیں۔ تا کہ وہ گھر کے دیگر گوں ہوتے ہوئے حالات کو سنبھال سکے۔ امریکہ جانے کے شوق میں وہ اب تک کہیں جم کر ملازمت نہ کر سکا تھا۔ ہر چار چھ مہینے کے بعد مالکان سے لڑ جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتا۔

''وہ......وہ......آ رہے ہیں...... پرسوں پاکستان پہنچ جائیں گے۔'' مرزا صاحب کے بتانے کا انداز کسی ایسے بچے سے مشابہ تھا جو کوئی جرم کر بیٹھا ہو۔

''ابو یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ بڑی اچھی خبر ہے۔'' فاطمہ کھل اٹھی۔

''خاک اچھی خبر ہے۔ اس کی ماں حقارت سے بولیں۔ جس نے برسوں پتا نہ لیا کہ دوست کس حال میں ہے۔ جیتا ہے یا زندگی کی گاڑی کھینچتے کھینچتے گر پڑا ہے۔ اب انھیں دوست کی یاد آئی کہ چلو پاکستان تو جانا ہی ہے ہوٹل کا خرچہ بھی بچے گا اور قسم قسم کے کھانوں سے خاطر مدارات الگ ہوگی۔ اب چل کے کاٹھ کے الو مرزا صاحب کے یہاں ٹھہرتے ہیں۔

''اماں خدا کا نام لیں۔ ہر وقت اپنی کڑوی کسیلی باتوں سے ابو کا جی جلاتی رہتی ہیں۔'' اپنے ابو کو کاٹھ کا الو کہنے پر فاطمہ اپنی ماں پر برہم سی ہوگئی تھی۔

''بیٹی سچی بات تو کلیجے پر لگتی ہی ہے۔ انھوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ انھیں ہاتھ نچا نچا کر بات کرنے کی پرانی عادت تھی۔

''اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارا چہیتا باپ جرم بنا یوں کھڑا نہ ہوتا، بہر حال میں کہے دیتی ہوں کہ مجھ سے یہ مفت کی خدمت ودمت ہرگز نہ ہوگی۔ میں انھیں اپنے گھر ٹھہرانے والی نہیں۔ بس میں صاف صاف بتائے دے رہی ہوں۔''

''عالیہ بیگم آپ کو میرے دوست کے غم میں دبلی ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اس نے ہوٹل کا کہا تھا اور میں اس کے لئے ہوٹل کا انتظام ہی کرنے جا رہا ہوں۔ آپ کی ننھی سی جان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔'' مرزا صاحب جاتے ہوئے فاطمہ کی والدہ کے بھاری بھرکم وجود پر طنز کر گئے تھے۔ فاطمہ کو اپنے باپ کی یہی ادا بہت بھلی لگتی تھی کہ وہ شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

"اماں آپ بھی بس حد کرتی ہیں۔ موقع محل تو دیکھ لیا کریں، بس شروع ہو جاتی ہیں۔" مجتبیٰ نے اپنی اماں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا۔

"لو میاں میں نے ایسا کیا کہہ دیا کہ قیامت آ گئی۔ اب اس نگوڑے منہ سے سچ کے دو بول بھی نہ نکلیں۔"

"اماں وقت کی نزاکت کا تو خیال کر لیا کریں۔" مجتبیٰ عاجز ہونے والے انداز میں بولا۔

"ان کا آنا آپ کے بیٹے اور بیٹی دونوں کا مستقبل سنوار سکتا ہے، اور آپ گھر آئی خوش قسمتی کی دیوی کو روک کر اس کی ناقدری کر رہی ہیں۔"

"تمہارا اور فاطمہ کا مستقبل ان کے یہاں ٹھہرنے سے کیسے سنور سکتا ہے۔" عالیہ بیگم کو اپنے بچوں اور بچیوں کے مستقبل سے ہر ماں کی طرح گہری دلچسپی تھی۔ سوال کیا۔

مجتبیٰ نے ماں کو نرم پڑتا دیکھا تو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"اگر انکل ریاض شیخ مان گئے اور مجھے امریکہ بلوانے کا بندوبست کرنے کا وعدہ کر لیا تو سمجھ لیں کہ میرے ساتھ ساتھ اس گھر کی قسمت بھی بدل جائے گی اور پھر ایک اور بات بھی ہے۔" مجتبیٰ کا لہجہ کچھ پر اسرار اور رازدارانہ سا ہو گیا۔

"انکل کا ایک خوبصورت جوان بیٹا بھی ہے۔ اور ہماری فاطمہ اب شادی کے قابل بھی تو ہے۔"

"بھائی آپ فضول باتیں نہ کیا کریں۔" یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

اماں کی ان "فضول باتوں" میں دلچسپی کو محسوس کر کے مجتبیٰ خون سیروں بڑھ گیا۔ وہ زور وشور سے اپنے باپ کی وکالت کرنے لگا۔ پتھر جیسی ماں پہلے ہی موم ہو چکی تھی اب بالکل پگھل گئی تھی۔

"اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے ان کے لئے ہوٹل میں کمرہ بک کرا دیا ہے۔"

بیوی کی ساری باتوں کا جواب مرزا صاحب نے ایک جملے میں دے کر ختم کر دی۔ پھر انھوں نے لاکھ سر پٹخا، مجتبیٰ قائل کرنے کی کوشش کی، فاطمہ کو آگے کیا گیا کہ باپ کی لاڈلی ہے ضرور باپ کو راضی کر

لے گی، مگر مرزا صاحب اپنے موقف سے بالکل بھی نہ ہٹے۔

فاطمہ کو باپ کا یہ انداز بہت ہی بھایا۔اس نے شاذ و نادر ہی باپ کو ماں کے سامنے سرو و قامت اختیار کرتے دیکھا تھا۔

اگلے دو تین دنوں تک مرزا گھر سے تقریباً غائب ہی رہے۔مجتبیٰ کے "ہاتھ بٹانے" کی پیشکش انھوں نے بے دردی سے ٹھکرا دی تھی۔مجتبیٰ کو اپنے شفیق باپ سے ایسی سختی اور بے توجہی کی امید نہ تھی۔مرزا صاحب تو آج کل کسی اور ہی جہاں میں تھے۔ان کے چہرے کی سنجیدگی اور گمبھیرتا فاطمہ کا دل ہلا دیتی۔کچھ پوچھنا چاہتی تو باپ کی آنکھوں میں چھائی اداسی زبان لڑکھڑا دیتی۔وہ یہ سوچ کر چپ ہو جاتی کہ جب وہ "پہلے جیسے" ہو جائیں گے تو اسے سب کچھ بتا دیں گے۔ایک وہی تو ان کی راز دار تھی۔جس سے وہ اپنے دل کی بات کر لیتے تھے۔

اس دن مرزا صاحب رات دس بجے گھر پہنچے تو بہت ہی تھکے تھکے اور مضمحل سے لگے۔بیوی کی زبان میں کھجلی ہونے لگی۔پر وہ طبیعت پر جبر کر کے چپ سادھے رہیں۔

"ابو آپ ٹھیک ہیں نا؟" فاطمہ اپنی نرم و نازک انگلیوں سے ان کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بیٹی بس ذرا تھک گیا ہوں۔ریاض کے ساتھ کافی مصروف رہا۔" ان کے تھکے تھکے لہجے میں ان کی مصروفیت کی کہانی چھپی تھی۔انھوں نے کئی دنوں سے دفتر سے بھی چھٹی لے رکھی تھی۔سب کو ان کی "مصروفیت" کے بارے میں جاننے کا اشتیاق تھا۔مگر وہ خود بتاتے تو معلوم ہو سکتا تھا۔ورنہ آجکل وہ جس موڈ میں تھے،ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

"ابو آپ انکل ریاض کو گھر کب لا رہے ہیں؟"۔مجتبیٰ کو وقت ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"بیٹے وہ کل آئیں گے۔۔میرا مطلب ہے کہ میں انھیں کل لے کر آؤں گا۔"

"اب کل بھی بھلا آنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔وہ تو۔۔۔" وہ اچانک چپ ہو گئیں۔اب قینچی کی طرح چلتی زبان کا کیا کرتیں جو رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

"ابو انکل کو کھانے میں کیا پسند ہے۔میں ساری ڈش خود تیار کروں گی۔" اس سے پہلے کہ اماں کچھ اور کہیں،فاطمہ نے گفتگو کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

"نہیں بیٹا کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لے ہی آئیں گے۔ زیادہ سے زیادہ چائے پہ دو تین لوازمات کا بندوبست کافی رہے گا۔ ویسے بھی کل رات ان کی واپسی کی فلائٹ ہے۔"

"کل رات وہ واپس جا رہے ہیں۔" مجتبیٰ کے خوابوں کا محل چشم زدن میں مسمار ہو گیا۔ اور اماں نے یہ محسوس کیا کہ فاطمہ یکدم سے بوڑھی ہو گئی ہے۔ حالانکہ وہ ۲۳۔۲۲ سال سے زیادہ کی نہ تھی۔

انکل ریاض اس کے تصورات سے مختلف نہ تھے۔ جیسے اس کے ابو تھے ویسے ہی وہ گریس فل، جامہ زیب، آنکھوں سے جھلکتی ذہانت، سنجیدگی و متانت کا نمونہ تھے۔ البتہ کوئی بات تھی جو اسے بے چین کر رہی تھی۔ اسے ان کے چہرے کی مسکراہٹ نقاب سی لگی، سکون کے پیچھے اضطراب کی موجیں کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"بھابھی مجھے احساس معلوم ہوا کہ آپ لوگ ایک شادی کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے تھے اور آج ہی لوٹے ہیں۔"

عالیہ بیگم نے ریاض شیخ کی بات سن کر شوہر کو پھاڑ کھا جانے والے انداز میں مگر وہ بیوی کی طرف متوجہ ہی نہ تھے۔ ریاض صاحب کہہ رہے تھے۔ "اسی لئے آپ کو اس حادثے کا بھی علم نہ ہوگا جس نے میری زندگی کو گہنا دیا ہے۔ میں واپس جا رہا ہوں، اپنا سب کچھ لٹا کے۔ کچھ بھی تو باقی نہیں بچا۔"

"حادثہ۔۔۔کون سا حادثہ۔۔۔" بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی اور سوال نامکمل ہی رہ گیا۔

"بھابھی میری طرف سے اسے حقیر سا تحفہ سمجھ کر قبول کر لیں۔" ریاض صاحب نے ڈالروں کی خاصی موٹی گڈی عالیہ بیگم کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اتنا ہراساں رہا کہ آپ لوگوں کے لئے کوئی تحفہ بھی خرید نہ سکا۔ دراصل کینسر کے ہاتھوں اکلوتے جوان بیٹے کی موت نے مجھے ہوش و حواس سے بالکل بے گانہ کر دیا تھا۔ وہ جس نے زندگی میں کبھی اس سرزمین پر قدم تک نہ رکھا تھا مرتے ہوئے "اپنی زمین" میں دفن ہونے کی خواہش کر بیٹھا۔ کچھ لوگوں کے لئے مٹی کی محبت بھی شاید وراثت کی طرح منتقل ہوتی ہے۔ میں اسے اس کی اپنی زمین کے حوالے کر آیا ہوں۔ اگر ہو سکے تو کبھی کبھار اس کی قبر پر فاتحہ پڑھوا دیجئے گا۔"

تبدیلی/ زاہد رشید

اس نے کروٹ بدلی۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

وہ سوچ رہا تھا۔

اس نےغلطی کی، بہت بڑی غلطی۔

اسے اپنی بیٹی پر اس قدر پابندیاں نہیں لگانی چاہئے تھی۔

اسے مخلوط تعلیمی نظام میں اپنی بیٹی کو پڑھانا چاہئے تھا۔

یا کم از کم کوچنگ سینٹر بھیجنا چاہئے تھا جہاں مخلوط تعلیم دی جاتی ہو۔

وہ بڑا بے تاب تھا۔

نسبت کہیں طے ہی نہیں ہو رہی تھی۔

کالی رنگت ۔۔۔اس کی بیٹی کی کالی رنگت ۔۔۔ گوری چٹی بہو کے خواہش مند ماں باپ بھلا اسے کیسے قبول کر لیتے۔

اگر وہ مخلوط تعلیمی نظام میں پڑھ رہی ہوتی ۔۔۔؟

تو شاید اسے کوئی پسند کر لیتا۔

روز روز کی ملاقات تو دو ملنے والوں کو بیگانہ کر دیتی ہے۔

ایک دوسروں کی خامیوں سے۔

ان کے نزدیک اہم نہیں ہوتی

حسن وصورت کیا ہے؟۔۔۔ سیرت بھی نہیں۔

کاش ۔۔۔!

اس نے پھر کروٹ بدلی۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پر وہ سو گیا۔

صبح وہ خوش تھا اور کسی حد تک مطمئن بھی۔ اس نے بیٹی کو نوکری کرنے کی اجازت دے دی۔

وہ کافی عرصے سے ضد کر رہی تھی۔

اور پھر ایک دن۔

اس کے ایک پرانے ساتھی نے بڑی فکر مندی سے کہیں چلنے کو کہا۔

اور وہاں پہنچ کر کافی تردد کے بعد۔۔۔ بہت رازدارانہ انداز سے سرگوشیوں میں کہا۔

وہ تمہاری بیٹی۔۔۔

کیوں۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔؟

تمہاری بیٹی کل۔۔۔

کل کیا۔۔۔ آگے بھی تو بولو۔

اس کی بے تابی بڑھ گئی۔

اس کے دل میں ایک لمحے میں اَنگنت خدشات نے جنم لے لئے۔

وہ کل ایک آدمی سے۔۔۔ بس اسٹاپ پر کھڑی باتیں کر رہی تھی۔

بے ساختہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس کا دوست حیران رہ گیا۔۔۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔۔۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

دوست نے دوست کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

اگر وہ رشتہ بھیجے۔۔۔ میں۔۔۔ میں قبول کرلوں گا۔۔۔ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔

اس کا دوست اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے دوست میں تبدیلی بڑی عجیب مگر معنی خیز لگی۔

خودکش دہشت گرد / فضا اعظمی

مری تاریخ کے ابواب تم مجھ کو نہ دکھلاؤ
یہ سارے میں نے دیکھے ہیں
یہ خوابوں کی کتابیں ہیں
خدارا بند کر دو ان کتابوں کو
کئی صدیاں میں آوارہ پھرا ہوں ان سرابوں میں
خدارا بند کر دو ان سرابوں کو
مری ذلت، مری رسوائی کا مرہم نہیں ان میں
مداوائے غم کاری نہیں ان میں

اگر تم میرے ہمدم ہو، اگر تم میرے رہبر ہو
تو مجھ کو یہ بتاؤ تم
میں کیسے سرنگوں کر دوں کلیسا کے مناروں کو
میں کیسے منہدم کر دوں شوالوں کے دواروں کو
میں کیسے بھسم کر دوں بستیاں اہل کنیسہ
مجھے بندوق دو، بارود دو، تیزاب دو، تلوار دو، نیزہ دو، خنجر دو
اگر تم میرے ہمدم ہو، اگر تم میرے حامی ہو
تو مجھ کو یہ سکھاؤ تم

میں ہمدم ہوں تمہارا اور میں حامی ہوں
تمہارے کرب لاچاری سے واقف ہوں

تمہارے واسطے پہلا سبق یہ ہے
کہ اس بچے کے ہاتھوں میں کتاب عہد نو دیدو
تم اس کے ہاتھ میں بازیچۂ شمس و قمر دیدو
تم اس کے ذہن میں سرمایۂ ذوق ہنر بھر دو
تم اس کو علم نو کی روشنی سے بہرہ ور کر دو

تمہارے سارے بدلے یہ چکا دے گا
زمانے کو بتا دے گا
کہ جو تاریخ میں لکھا ہے وہ سچ ہے۔

☆

امید و بیم / احمد سعید فیض آبادی

یہ گم سم دل گرفتہ لوگ کس دھرتی کے باسی ہیں
جو اپنی ذات کے مرگھٹ میں پژمردہ
چتا کی آگ میں اندر ہی اندر جلتے رہتے ہیں
کسی بدروح کی زد میں
بہار آئے کہ پت جھڑ
آتی جاتی رت کی کیفیت سے
ان کے جسم و جاں نا آشنا ہوں
جیسے صدیوں سے جہالت جرم، غربت اور بیماری
جینوا کیمپ، امدادی رسد، بدحالی، محرومی
شناخت اپنی الگ رکھتے ہیں یہ اقوام عالم میں
معاشی قتل جیسے سانحہ پر بھی کبھی
شکوہ بلب، حیرت زدہ ہوتے نہیں دیکھا
کہ جیسے گونگے بہرے بے بصیرت لوگ
شکستہ خواہشوں کے دکھ میں روتے ہیں نہ ہنستے ہیں
عجب اک بے حسی کی دھند میں بے سود
روز و شب گزارے جا رہے ہیں
مگر یہ دل گرفتہ لوگ امید و بیم کے مرگھٹ میں
کب تک دن گزاریں گے؟
میں اکثر سوچتا ہوں...... میں اکثر سوچتا ہوں

آئندہ / عادل حیات

میں اپنے گمشدہ احساس کی آہٹ
ابھی تک سن رہا ہوں
موسم امید کہتا ہے
کہ مجھ سے روٹھ کر وہ چھپ گیا ہے
پر کوئی فصلِ بہاراں
جب بھی آئے گی
اسی کے ساتھ وہ بھی
لوٹ آئے گا
امنگیں زیست کرنے کی
مرے اندر جگائے گا

(۸۹/۷/۳، گراؤنڈ فلور، ووڈ سائڈ اپارٹمنٹ،
گلی نمبر ۲، غفار منزل جامعہ، نئی دہلی۔)

پرانا مکان نیا مکین / اسحاق ساجد۔ جرمنی

دیواروں پر کائی جمی ہے
سوکھی بیلیں لٹک رہی ہیں
رنگ وروغن سے محروم
اس کہنہ خاموش حویلی کے کمروں میں
کیسے ٹھاٹ سے
کیسی بے فکری سے
رہتی ہے اب
اک ویرانی

حامد علی سید

سبز بیلیں جل رہی ہیں

سروں پر زرد سورج ہے مسلط
تپش سے سبز بیلیں جل رہی ہیں

حسیں شامیں بھی اب تو گھل رہی ہیں
عذابِ تشنگی اترا گھروں میں
نلوں میں دوستو پانی نہیں ہے
یہاں پر کوئی آسانی نہیں ہے

ہے مجھ میں ایک بے خوابی کا عالم
مری حالت ابھی سنبھلی نہیں ہے
گزشتہ رات سے بجلی نہیں ہے

قدم زنجیر ہوکر رہ گئے ہیں
ٹریفک جام ہوتا جا رہا ہے
یہ منظر عام ہوتا جا رہا ہے

☆

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اظہر قادری کی شعری ونثری خدمات

پروفیسر کنیز بتول شعبہ اردو جامعہ ڈھاکا

سابق مشرقی پاکستان کے دور اول (۱۹۶۰۔۱۹۵۰) میں جو شعرا و ادبا ابھرے ان میں اظہر قادری خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ ۱۹۵۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ اردو کی سند لے کر ڈھاکے آئے۔ اور رفتہ رفتہ یہاں کے علمی و ادبی افق پر چھا گئے۔ موصوف اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ انگریزی ادب، تاریخ اور فلسفہ پر ان کی نظر گہری تھی۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز کلکتہ یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے سے ہوا، اور ان کا یہ ادبی سفر مسلسل جاری رہا کتاب علم کے شوق اور زندگی کے مشاہدات و تجربات سے ان کے فکر و نظر کا دامن وسیع تر ہوتا گیا۔ انھوں نے مشرقی پاکستان میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بہت جلد ایک انفرادی مقام بنالیا۔ سابق مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا اور علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ کئی ادبی انجمنوں سے منسلک رہے۔ ایک ہفتہ وار رسالہ "سب رنگ" جاری کیا۔ سینٹ گرے گریز کالج ، ہولی کراس کالج، شعبہء اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی اور جگن ناتھ کالج سے وابستہ رہے۔ انھوں نے پاکستان کونسل ڈھاکا میں بنگالیوں اور دیگر غیر بنگالیوں کو اردو پڑھانے کے فرائض بھی انجام دیئے۔ نیز سابق مشرقی پاکستان میں بننے والی کئی فلموں کے لئے گانے اور مکالمے بھی تحریر کیے۔ انقلاب بنگہ دیش کے بعد وہ کراچی چلے گئے۔ اردو زبان و ادب کی محبت نے وہاں بھی ان کو مستعد اور سرگرم رکھا۔ ان کے علمی و ادبی نگارشات تنقید اور شاعری کی صورت میں پاکستان اور ہندوستان کے مختلف رسالوں اور اخباروں کے ادبی صفحات میں شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۸۶ تک سندھ یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انھوں نے جناح خواتین یونیورسٹی میں بھی پڑھایا۔

اظہر قادری بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، تنقید نگار، محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل اور تجربہ کار معلم بھی تھے۔

اصنافِ سخن میں اظہر قادری نے نظم، غزل، رباعی اور قطعات میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے۔ رباعی نگاری میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ علامہ رضا علی وحشت کلکتوی اظہر قادری کی رباعیات کا فنی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے: ان کی رباعیوں میں ایک والہانہ کیف پایا جاتا ہے۔ جس کا اثر پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں پر گہرا ہوتا ہے۔" ("فکروفن کے محرکات" مرتب: شفیق احمد شفیق)۔

اظہر قادری کا شمار پاک و ہند کے ممتاز ناقدوں میں ہوتا ہے۔ ان کا شعور نقد شاعری میں بھی اپنی کارفرمائی دکھاتا ہے۔ وہ ایک کمیٹڈ ترقی پسند قلمکار تھے۔ انھوں نے ہمیشہ سادہ زندگی گزاری اور آسائش کے حصول کے لئے کبھی بھی اپنے اصولوں کا سودا نہیں کیا۔ ان کے فکرونظر اور ادبی کاوشوں کا موضوع اور محور انسان اور اس کے گوناگوں مسائل تھے۔ انھوں نے خیالی تو تا مینا اڑانے کے بجائی زندگی کے حقائق کی آئینہ داری کی۔ وہ حصلہ مندی اور رجائیت کے علمبردار تھے۔

منزل پہ پہنچنا ہے تو چلنا سیکھو: گرنا تو ہے آسان سنبھلنا سیکھو
حالات سے یہ تم پہ اداسی کیوں ہے: ظلمت کو اجالے سے بدلنا سیکھو

اظہر قادری کی غزلیں جدید ہونے باوجود روایت منحرف نہیں۔ ان کا اسلوب روایت سے قریب ضرور ہے مگر خیالات اور موضوعات جدید ہیں اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں زندگی کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہیاور تغزل کی شان بھی باقی رکھی ہے۔ انداز بیان صاف، سادہ اور دلکش ہے۔ نظموں میں ان کا طرز اظہار علامتی انداز کا ہے۔ خیالات میں بلندی، عمق اور وسعت ہے۔ حقائق وصداقت کا دامن ہمیشہ تھامے رکھا ہے۔

ہوتی ہے اک ہمیں سے خطا تیرے شہر میں: ملتی ہے اک ہمیں کو سزا تیرے شہر میں
رہتا ہے روز دستِ خزاں کا لہو سے لال: ہوتی ہے روز قتل صبا تیرے شہر میں
اظہر ایک شکوہ بلب تو نہیں یہاں: ہر شخص کو ہے تجھ سے گلہ تیرے شہر میں
ہوائیں چلتی ہیں ہر وقت تند و تیز یہاں: تمہارے شہر میں کیسے کوئی چراغ جلے
لا سکے حرف شکایت عشق میں لب پر نہ ہم: ہر ستم اس نے کیا ہم پر بہ اندازِ کرم
دشت میں ترسا کئے ہم لوگ اک اک بوند کو: شہر میں برسا کئے ہر شام کو ابر کرم

اظہر قادری شاعری کو اپنے احساس وفکر کے اظہار کا ایک موثر ذریع سمجھتے تھے۔ غزل ہو

یا نظم، رباعیات ہوں یا قطعات ان سب حیات وکائنات کی تصویر کشی انسانی عظمت کے حوالے سے کرتے رہے ہیں۔ وہ انسان دشمن اقدار کے خلاف ہمیشہ ڈٹے رہے اور ظلمت کے استعارے کو روشنی کی معنویت سے مات دینے کی کی تخلیقی کوشش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "روشنی کا ساتھ دو" خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ چند اشعار اسی نظم سے پیش کئے جاتے ہیں۔

روشنی تاریخ انسانی کا باب باوقار
روشنی ہر عہد کے انساں کے دل کی آرزو
روشنی انساں کے چہرے کا جمال
روشنی تہذیب کی شائستگی
روشنی ایوبؑ کا صبر جمیل
روشنی مریم کی عصمت
روشنی اعجازِ عیسیٰؑ کا ظہور روشنی شہر مبارک علم کا
روشنی دروازہ شہر علم کا
روشنی کرب وبلا میں پرچم ابن علی
روشنی سے پیار ہے تم کو اگر
روشنی کا ساتھ دو
تیرگی کو مات دو

بحیثیت نقاد پروفیسر اظہر قادری ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا ناقدانہ شعور فطری ہونے کے ساتھ ساتھ پختہ بھی ہے۔ ان کا انتقادی رویہ سماجی تنقید نگاری کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ وہ فن پاروں کا تجزیہ تاریخی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی حوالوں سے کرتے تھے۔ ان کی تنقید صداقت بیانی کے ساتھ ساتھ اپنے دامن میں وہ ہمدردی بھی رکھتی ہے جو ایک متوازن مزاج ناقد کی پہچان ہے۔ ان کے انتقادی سرمائے کا معتدبہ ادبی مسائل پر محیط ہے۔ وہ جدید انسانی اور ادبی مسائل پر انتہائی خرد افروزی کے ساتھ بحث کے دریچے کھولتے ہیں۔ ان کا طرزِ اظہار عالمانہ ہونے کے باوجود نہ خشک ہے اور نہ بے کیف۔ ان کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے شفیق احمد شفیق لکھتے ہیں:

"اظہر قادری تنقید کے سائنٹفک اصولوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ادب، سیاست اور فلسفہ میں ان کا اپروچ قابل رشک ہے۔ عالمی

ادب اور فلسفے کے مطالعہ نے ان کے اندر گہرائی پیدا کردی ہے۔"

اظہر قادری کے مضامین مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔انھوں نے ان کے سمیٹنے کا کبھی سوچا نہیں۔یہی حال ان کے شعری سرمایوں کا ہے۔ان کی غزلیں، نظمیں اور رباعیات بھی پاک وہند کے موقر جریدوں میں منتشر ہیں۔شفیق احمد شفیق نے ان کے کچھ مضامین مختلف رسالوں سے تلاش کر کے ایک مجموعے کی صورت میں "فکروفن کے محرکات" کے نام سے ۲۰۰۱ میں شائع کیا ہے۔اس میں ہندو شعرا بارگاہِ رسول میں، فکروفن کے بنیادی محرکات، قدریں۔۔قدیم وجدید، شخصیت سے ذات تک، شاعری کی ابتدا اور کیپٹن قمر صدیقی وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن کے مطالعہ سے فکروشعور جلا اور پختگی حاصل ہوتی ہے۔

"سماج کا شعوری ادراک" میں اظہر قادری نے انسان، اس کی تاریخ اور سماج کے باہمی رشتوں اور ان کی اعلیٰ وادنیٰ قدروں پر ناقدانہ روشنی ڈالی ہے۔"قدریں۔۔۔قدیم وجدید" میں فنی وادبی روایات کا تجزیہ تاریخی، معاشرتی اور معاشی تناظر میں ماضی وحال کی گمشدہ کڑیوں کو جوڑ کر کیا ہے۔انھوں نے اپنے انتقادی مقالات میں صرف تخلیقات پر اظہار خیال نہیں کیا ہے اور نہ صرف تخلیق کاروں پر اپنے قلم کا زور صرف کیا ہے بلکہ تخلیقات کو ان کے پس منظر میں رکھ کر ان کے خالق کے ذہنی رویوں اور عصری صداقتوں کو بہم کر کے اپنی رائے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

انسانوں سے محبت ان کا شیوہء حیات رہا۔نہ کسی سے کبھی الجھے اور کسی کے ساتھ اپنا رویہ سخت رکھا۔مزاج میں بلا کی نرمی تھی۔خوش اخلاقی اور انکساری ان کی فطرت ثانیہ بنی رہی۔انھوں نے اپنے شعروں میں انسان دوستی اور اپنائیت کے ان جذبوں کا بڑی خوبصورتی سے اظہار کیا ہے۔

کہتے نہیں کسی کو بھی بیگانہ دوستو: ہے اپنا سب سے رشتہء یارانہ دوستو

چاہو تو دل ہر اک کا محبت سے جیت لو: دنیا میں کوئی بھی نہیں بیگانہ دوستو

اس آرزو میں کہ اوروں کو کچھ قرار ملے: تمام عمر مری بے قرار گزری ہے۔

اظہر قادری کی تخلیقات نظم ونثر میں ایک عمق کے ساتھ ساتھ جمالیاتی اہتمام بھی ہے۔وہ نری حقیقت نگاری کے خلاف تھے۔فکر کو فن بنانے میں جو ادبی قدریں اپنا رول ادا کرتی ہیں ان کا انھوں نے ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مطائبات

جادو کا ہاتھ / ابوالفرح ہمایوں

کسی دانشور کا قول ہے: "بیوی سے محبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے وہاں کھجایا جائے جہاں کھجلی نہ ہو رہی ہو۔" اس سے اہل دل بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کھجلی کا رومانس سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اب تو کھجانا بھی آرٹ کی حدود میں داخل ہو چکا ہے۔

موت اور خارش سے کسی کو مفر نہیں۔ لیکن جس طرح طب کی دنیا میں تحقیقات کا عمل جاری رہتا ہے، اسی طرح کھجلی کے سلسلے میں ایک اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ اس موذی مرض سے نجات حاصل کرنے کا تازہ ترین علاج یہ دریافت کیا گیا ہے کہ آم زیادہ سے زیادہ کھائیں اور کھلائیں۔ بلکہ کھلانے پر زور زیادہ ہے۔ جیب کی فکر سے یکسر آزاد ہو جائیں، کیوں کہ ہر مہمان اپنا نصیب اپنے ساتھ لاتا ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی مرض جاتا رہے گا، اور بہت ممکن ہے کہ مریض بھی۔ (تقدیر پر کس کا زور چلتا ہے)

کھجلی بڑی ظالم شے ہے۔ کھجاتے رہیے...... اور...... کھجاتے ہی رہیے۔ لیکن یہ ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور کسی طرح آپ کے قابو میں نہیں آتی۔ کھجلانے کے لئے دونوں ہاتھوں کو انتہائی تکلیف دہ انداز میں طرح طرح سے ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے، بالکل ٹیڑھی کھیر کی طرح۔ مزید دلچسپ صورتِ حال تو اس وقت پیش آتی ہے جب آپ اپنی انگلیاں فگار کر کے اور عقل کے ناخن استعمال کر کے موقعۂ واردات تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن تب آپ کی مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب اچانک کھجلی اپنی جگہ سے کھسک کر ذرا دائیں بائیں یا آگے پیچھے ہو جاتی ہے۔ اب آپ ہیں کہ انتہائی بے چینی کے ساتھ پہلو پر پہلو بدل رہے ہیں اور اپنی سی ہر کوشش کر رہے ہیں کہ اصل ہدف کو جالیں، مگر بے سود۔ خارش دم بہ دم بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اور تب ایسے میں آپ کنگھی یا کسی کھردری لکڑی وغیرہ کا سہارا تلاش کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ آپ اپنے بدن کو لہولہان کر سکیں۔ لیکن کھجلی تو کھجلی ہی ہے۔ اس کا کام چلنا اور چلتے ہی رہنا ہے، اور وہ آپ کو اونچا اڑانے کے لئے چلتی ہی چلی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد آپ بالآخر نڈھال ہو کر گر پڑتے ہیں۔

کچھ دیر بعد جب آپ ہوش کی ناخن لیں گے تو آپ پر ایک نیا راز آشکار ہوگا۔ سرشاری کی ایک

عجیب کیفیت آپ کے قلب وذہن پر طاری ہو جائے گی۔ آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے کھجلی آپ کی پشت پر تھی ہی نہیں یا وہ آپ کے بے ہنگم اور بے ڈول جسم کو چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے یوں جیسے کوئی بدروح کسی عامل کی جھاڑ پھونک سے خوف زدہ ہو کر بھاگ گئی ہو۔ اب آپ اس سوچ میں پڑ جائیں گے کہ کہیں آپ عالم بالا میں تو نہیں پہنچ گئے؟ موت کا دہشتناک خیال آتے ہی آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اور چند لمحے کانپنے کے بعد آپ کی آنکھ کھل جائے گی۔ لیکن ابھی آپ اپنی نئی زندگی کی خوشی سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پائے ہوں گے کہ کھجلی دوبارہ آدھمکتی ہے۔ گویا کسی عامل غیر کامل کا وظیفہ اپنے اثر کی میعاد ختم کر چکا ہو۔ اب آپ دوبارہ تڑپیں گے، مچلیں گے اور فریاد کریں گے لیکن کچھ کر نہ پائیں گے۔

اور اب وہ نازک وقت آتا ہے جب آپ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بیگم کی خدمات حاصلکرنے پر مجبور ہوں گے۔ اسی لازوال دن کے لئے ہمارے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ شادی سنت اور عبادت بھی ہے۔ شادی کے بعد ایک عدد خاتون آپ کی شریکِ حیات بن جاتی ہیں اور وقت بے وقت کام آتی ہیں۔ آپ نے وہ مثل تو سن رکھی ہوگی۔ "اہلیہ آید بکار" یعنی بیوی کام میں آتی ہے۔ بعض کم فہم لوگوں نے اس کے غلط سلط معنی بھی گھڑ لئے ہیں، جیسے "بیوی کام سے آتی ہے۔" یعنی جب اسے آپ سے کوئی فرمائش منوانی ہو۔ دوسرے معنی یہ لئے گئے ہیں کہ اہلیہ کار میں آتی ہے۔ یہ معنی تو انتہائی احمقانہ ہے۔ کیا بیوی گھر پر نہیں رہتی جو کہیں اور جگہ سے کار پر آئے گی۔

مگر پیروں کی خارش کی بات ہی اور ہے۔ یہ کھجلانے کے لئے بڑی آئیڈیل جگہ ہے۔ ہر چیز آپ کے سامنے اور مکمل طور پر دسترس میں ہے۔ آپ آٹھ ناخنوں کا استعمال نہایت بے دردی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ داد اور چنبل کو پھلنے پھولنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ اور پھر یہاں کھرنڈ بھی خوب جمے گا۔ کھرنڈ کو کھرچنے میں جو لطف ہے وہ دنیا کی کسی اور چیز میں کہاں۔ جب جب آپ کھرنڈ کو کھرچیں گے تب تب لذت اور سرشاری کی ایک نئی دنیا سے گزریں گے۔ ایسے موقع پر آپ کسی کی کچھ مت سنیں۔ گھر والے بہت کچھ کہتے رہیں۔ دوستوں اور دفتر کے ساتھیوں کے تلخ و ترش جملوں کو بھی نظر انداز کر دیں، کیوں کہ کھرنڈ کھرچنے کا جو مزہ ہے اس کے آگے دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔

گزشتہ دنوں ہمارے فرزند دلبند ہمیں ایک نہایت ہی عجیب اور انتہائی غریب یعنی کم خرچ بالا

نفیس قسم کا تحفہ پیش کیا۔ ایسا نادر و نایاب تحفہ شاید ہی کوئی کسی کو دیتا ہوگا۔ خصوصاً بیٹا باپ کو۔ یہ پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا بازو ہے۔ جس کے دست حنائی کے عین درمیان پلاسٹک کے ہی پچیس عدد کانٹے پیوست ہیں۔ اس ہتھیلی کو اسمطلوبہ جگہ پر لے جائیں ایک بٹن دبائیں اور یہ کانٹے مسلسل گردش کر کے آپ کو سکون و راحت کی ایک نئی دنیا میں لے جائیں گے۔ آپ کا جب تک جی چاہے اس ہاتھ سے فائدہ اٹھائیں۔ آپ کے ہاتھ تھک جائیں گے لیکن یہ ہاتھ نہیں تھکیں گا جب تک کہ سیل ختم نہ ہو جائے۔

یہ زنانہ مگر بچکانہ ہاتھ ہے تو کانٹوں سے بھرا ہوا مگر بے حد کیف آور۔ ہمارا دوستانہ مشورہ ہے کہ آپ بھی یہ آلہ خرید لیں اور بوقتِ ضرورت اس کو استعمال کریں۔ کبھی کبھی کانٹے بھی اس قدر بھا جاتے ہیں کہ بے اختیار انھیں سینے سے لگا لینے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ اس دست خارزار کی کرامت دیکھ کر بے اختیار لبوں پر یہ مشہور مصرع آجاتا ہے ۔

"گلوں سے خار بہتر ہیں کہ خارش تھام لیتے ہیں"

اب آخر میں اطہر شاہ خاں کا ایک شعر سن لیجیے جو انھوں نے محفل کے آداب اور گنجے پن کے تعلق سے لکھا' فرماتے ہیں ۔

ہم اگر گنجے ہیں لوگوں کو توجہ کیوں دلائیں
سر میں کھجلی ہو تو گھٹنے پر کھجانا چاہیے

شخص و نقد

نثار ترابی۔۔۔جدید اردو غزل کا ایک توانا شاعر/ انجم جاوید

نثار ترابی ایک مدت سے شعر و سخن کی وادیوں میں فکر و خیال گل و لالہ کھلانے میں مصروف ہے۔ وہ شاعری کے اس سفر میں کامرانیوں کی منزلیں سر کئے چلا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کا شعری مجموعہ "ہر صدا مسافر ہے" مجھ تک پہنچا تو اس کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوا کہ نثار ترابی دوسرے مشاعرہ باز شعرا کی طرح صرف مشاعروں کے شاعر نہیں ہے بلکہ جو معیار وہ مشاعرے میں بنا چکا ہے وہی معیار اس کے مجموعے میں بھی موجود ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ مشاعرے میں تو غزل چمک گئی مگر اسے جب کسی رسالے یا کتاب میں پڑھنے کا موقع ملا تو وہ بے کیف لگی۔

نثار ترابی واقعتاً ایک جدید لب و لہجے کا ابھرتا ہوا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کا سفر تجربات و مشاہدات سفر ہے۔ سفر پر یاد آیا کہ نثار ترابی نے اپنے شعری مجموعے کا جو نام رکھا ہے اس میں ایک لفظ سفر بھی ہے۔ سفر ہی اس کی شاعری سب سے اہم اور نمائندہ استعارہ ہے۔ اس کے اس استعارے میں پوری کائنات کا رمز پوشیدہ ہے۔ انسان پیدائش سے موت تک سفر میں رہتا ہے زمین گردش میں رہ کر سفر طے کر رہی ہے، چاند، ستارے، سورج، کہکشاں، سارے سیارے مسلسل سفر میں ہیں۔ یہ زمین بھی یہ کائنات بھی قیامت تک مسلسل سفر کے مراحل میں رہے گی۔ اس پس منظر میں نثار ترابی کی شاعری آفاقی اہمیت کی حامل بن جاتی ہے۔ اس نے سفر کے استعارے کو ایک بھرپور معنویت دے کر علامت کی صورت دے دی ہے۔ جسے اس نے مختلف پیرائے اظہار کے ساتھ اپنی شاعری میں تقریباً ۲۶ بار استعمال کیا ہے۔ سفر کا یہ استعارہ اس کے شعور ہی نہیں بلکہ لاشعور کا بھی لازمی حصہ بن گیا ہے۔ جسے نثار ترابی نے بہت ہی شاعرانہ فن کاری کے ساتھ جا بجا برتا ہے۔ اس حوالے سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہے۔ شعری مجموعے کے آغاز ہی میں "حمد" میں سفر کا استعارہ استعمال ہوا ہے۔

تجھی سے حرف و صدا کا سفر سلامت ہے۔ تجھی سے خواب و دعا کا سفر سلامت ہے

اب چند اور اشعار دیکھیں کہ "سفر" کو اس نے کس کس طرح سے استعمال کیا ہے۔

لمبی مسافتوں کے سفر لکھ دیے گئے۔ ہم سو چل دیے ادھر کو جدھر لکھ دیے گئے

کسی سخن پہ بھی باب صدا نہیں کھلتا: یہ کس جہاں کا سفر ہے ذرا نہیں کھلتا

کبھی ہمزاد بھی تو ہمسفر اپنا نہیں ہوتا: ہمیشہ ساتھ رہتا ہے مگر اپنا نہیں ہوتا

سفر میں اپنے حصے کی مسافت یاد رہتی ہے: کہیں آباد ہونے پر بھی ہجرت یاد رہتی ہے

''سفر'' ہی کے لاشعوری سفر کو طے کرتے ہوئے نثار ترابی نے ایک غزل میں ردیف ہی ''مسافر'' رکھی ہے

یہ جو آنکھ بستی میں رت جگا مسافر ہے: خواب تو نہیں لیکن خواب سا مسافر ہے

کوئی موج کیا ٹھہرے ساحلوں کے پہلو میں: وقت کے سمندر میں ہر صدا مسافر ہے

نثار ترابی کے خمیر میں وطن سے محبت اس طرح گندھی ہوئی ہے جیسے شریانوں میں دوڑتا ہوا لہو۔ وہ وطن کی محبت کا بھی اظہار کرتا ہے تو یہ استعارہ اسے اکیلا ہونے نہیں دیتا۔

سمند کا سفر ہو یا سفر ہو وہ خلاؤں کا: مرے پاؤں میں رہتی ہے سدا زنجیر مٹی کی

نثار ترابی شعر کہنا جانتا ہے۔ وہ آس پاس کے ماحول سے بے خبر نہیں بلکہ چوکنا ہو کر گزرتا ہے۔ اس کی حسیات مکمل طور سے اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ بلا شک وشبہ وہ غزل کا ایسا شہسوار ہے۔ جس نے میدان میں گرنا نہیں سیکھا۔ اس کی شاعری زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کی عکاس ہے۔

ایک سازش سے الٹ جاتی ہے شاہی ساری: ایک دشمن بس دیوار بہت ہوتا ہے

یہ مرے عہد کے سورج کو کیا ہوا ہے نثار: اندھیرے چھوڑ گیا دن کی ضوفشانی میں

وہ بھی اترا ساحلوں پہ سب جلا کر کشتیاں: ہم نے خود بھی واپسی کے راستے رکھے نہیں

سرسراہٹ ہے کیسی مٹی میں: نقش تازہ ابھر رہا ہے کیا؟

کتنے سہمے ہوئے پرندے ہیں: پھر یہاں حادثہ ہوا ہے کیا؟

نثار ترابی جمالیات کا شاعر ہے۔ جمالیاتی حس اس کے رگ و پے میں بھری ہوئی ہے۔ وہ خود سراپا جمال ہے۔ ادب کا ''گوونِدا'' ہے۔ سو اس کی آنکھوں سے پھوٹتی شرارت کی کرنیں اور لبوں پر پھیلی ہوئی مسکان اسے یہ اشعار بھی عطا کرتی ہے۔

ضبط میں رکھتی ہے درویش مزاجی اپنی: ورنہ اس آنکھ کا اصرار بہت ہوتا ہے

تم نے دیکھا نہیں کردار ہوا کا شاید: پل میں خوشبو کو یہ آوارہ بنا سکتی ہے

اب تو اس حسن کے سانچے میں ڈھلا تیرا جمال: جس کی اک آنچ ہی آئینہ جلا سکتی ہے

اب مندرجہ بالا اشعار کے ان مصرعوں پر رُکیے اور پڑھتے جائیے۔

ورنہ اس آنکھ کا اصرار بہت ہوتا ہے

پل میں خوشبو کو یہ آوارہ بنا سکتی ہے

جس کی اک آنچ ہی آئینہ جلا سکتی ہے

اس پس منظر میں نثار ترابی کے مزید دو مختلف ڈھنگ سے کہے گئے اشعار کو دیکھیں۔

میں اس کے واسطے ہو جاؤں بے خبر کیسے : تمہاری آنکھ کا جادو ہے چل بھی سکتا ہے

ہوا کی کوئی بھی سازش بجھا نہیں سکتی : چراغ جلنے پہ آئے تو جل بھی سکتا ہے

ان تمام اشعار کی انفرادیت اپنی جگہ مگر صرف انکے مصرعوں کو بھی پڑھیں تو بھی لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

تمہاری آنکھ کا جادو ہے چل بھی سکتا ہے

چراغ جلنے پہ آئے تو جل بھی سکتا ہے

میرا کہنا یہ ہے کہ نثار ترابی نے ادب کو صرف اچھے شعر ہی نہیں دیئے بلکہ مصرعے بھی ایسے دیئے ہیں جو ضرب المثل کی طرح استعمال کیے جا سکتے ہیں اور جن کی اپنی ایک انفرادیت اور ردھم ہے۔ یہ مصرعے مفہوم کے اعتبار سے اپنے اندر داستان رکھنے کے ساتھ ساتھ انتہائی گہرائی اور کئی معنوی جہات کے حامل ہیں۔

نثار ترابی اردو شاعری کا عمر عیار ہے۔ اس کی زنبیل میں ایک دنیا آباد ہے۔ وہ ہر خاص و عام کو بالخصوص شعراء کو اپنی سحر آفریں شاعری سے متاثر کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ لہٰذا پورے پاکستان سے لے کر بیرونی ممالک تک ہر جگہ اس کی سخن سازی اور علم دوستی کی جڑیں مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں۔

اسے بے مروتی کے آسیب سے چڑ ہے۔ اس کی سرشت میں صرف محبت ہے، اسے نفرت سے نفرت ہے۔ اس کی شاعری میں ہر ایک سے محبت کرنے کا جذ ملتا ہے مگر وہ ان پر بھی تنقید کرنے سے بعض نہیں آتا جو مار آستیں نما دوست ہوتے ہیں۔ محبت کے جذبے کا ایک رنگ تو یہ ہے۔

تم سے رشتہ نہ شناسائی محبت والی : ہم سے کیوں زخم تمہارے نہیں دیکھے جاتے

اور دوسرا رنگ یہ ہے۔

اسے نثار ترابی میں کیسے لے کے چلوں : وہ یار جا کے صفِ دشمناں سے ملتا ہے

ناقدین کا یہ خیال درست ہے کہ نہ تو خیالات بدلتے ہیں اور نہ ہی الفاظ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ شاعر ہر تازہ شعر پہلے سے کہے گئے شعر میں پیش کردہ خیالات کو قدرے نئے رنگ اور نئے پیراہن میں بیان کرتا ہے۔ الفاظ وہی ہوتے ہیں صرف ترتیب اور طرز تزئین بدل جاتی ہے۔ اب شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ شعر کس ڈھب سے کہتا ہے۔ آیا شعر پہلے کہے گئے شعر کی بہ نسبت کچھ آگے بڑھا ہے یا معیار کے لحاظ سے اس سے کمتر ہے۔ نثار ترابی نے بعض اشعار میں غالباً دانستہ یہ تجربہ بھی کیا ہے اور ایک قدم آگے کا سفر

طے کر کے اسے ثابت بھی کیا ہے مثلاً محبوب خزاں کا ایک شعر ہے۔

چاہی تھی دل نے تجھ سے وفا کم بہت ہی کم: شاید اسی لئے ہے گلہ کم بہت ہی کم

نثار ترابی نے اسے قدرے مختلف زاویے سے آفاقی رنگ میں برتا ہے۔

یہ تو شاہوں کو بھکاری سی بنا دیتی ہے: سو مرے دل ہو تجھے خواہش دنیا کم کم

اس کی فطرت ہے جسے اپنا بنا لے اس پر: پڑنے دیتا ہے کسی اور کا سایہ کم کم

اسی طرح مجھے شکیل جعفری کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

پھر کسی انسان نے انسان کا خوں کر دیا: دور بیٹھا بھیڑیا یہ دیکھ کر رونے لگا

اس المیے کو نثار ترابی نے شعر کے پیکر میں یوں ڈھالا ہے۔

یہ کیسی قیامت ہے کہ جس سمت بھی جائیں: انسان میں انسان کا ڈر جاگ رہا ہے

نثار ترابی بلا شک وشبہ بہت ہی اچھا شاعر ہے۔ اسے صرف شعر وفن ہی کی نہیں بلکہ زندگی کی راہیں بھی دوسروں سے الگ تراشنے کا ہنر آتا ہے۔ اسے علم ہے اور خوب علم ہے کہ اس نے کہاں کہاں بساط بچھائی ہے اور کس طرح سے مہروں کو حرکت میں لاتا ہے۔ وہ مثبت سوچ کا شاعر ہے۔

میں شناسا نہیں اندھیروں کا: میرے آنگن میں چاند سوتا ہے

نثار جس مٹی سے تعلق رکھتا ہے اس میں وفا اور مروت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ سو وہ اپنے ملک سے اپنے دوستوں سے، اپنے عزیزوں سے اور آنگن میں سونے والے چاند سے گہری محبت رکھتا ہے۔ اور لاکھوں افراد سے ہٹ کر اپنے ماں باپ سے بھی محبت کرتا ہے۔ اس نے اپنے والد اور والدہ کے لئے بھی شعری تخلیقات بہ رنگِ غزل پیش کی ہیں۔ میں یہاں بطور خاص "والدہ جی" کے لئے کہی گئی دعائیہ غزل کے چند اشعار پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اترے مری دھرتی پہ سویرا مرے مولا: ہو ختم کسی طور اندھیرا مرے مولا

رکھنا مرے سر پہ اسے تا دیر سلامت: ممتا کا جو سایہ ہے گھنیرا مرے مولا

☆☆

حاصل تجزیہ
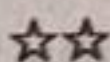
''پیش رفت انٹرنیشنل'' (تجزیہ و تبصرہ نمبر) پر چند تاثرات

محمد احمد سبزواری

کتابوں اور رسالوں پر تبصرے اور خال خال تجزیوں کی اشاعت اردو رسائل میں عام ہیں۔ مگر حالیہ تجزیوں اور تبصروں کو یکجا کر کے ایک خصوصی نمبر کی اشاعت اردو ادب کی تاریخ میں ایک اپج ہے جو یقیناً مستحق تحسین ہے۔

''پیش گفت'' میں بھی نقد نگاری کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان کو تنقید کے وقت پیشِ نظر رکھنے سے تنقید کی علمی و ادبی حیثیت کے معیار میں اضافہ ہوگا۔ میرے خیال میں تبصرے اور تجزیے میں فرق ہے۔ تبصرہ ایک سرسری جائزہ ہوتا ہے جس میں مصنف/مولف اور کتاب کا تعارف کرایا جاتا ہے اور اس کی چند خصوصیات کا ذکر کر دیا جاتا ہے، اگر شعری مجموعہ ہے تو چند اشعار کو نموتاً پیش کر دیا جاتا ہے۔ رسائل تبصروں کی اشاعت ہی کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہ تین چار صفحات میں دس بارہ تبصروں کو شامل کر کے مصنفین کی اچھی خاصی تعداد کو خوش کر دیتے ہیں۔

ماہنامہ ''افکار'' کے آخری دور میں، راقم کئی سال تک، مرحوم صہبا لکھنوی کی ہدایت کے مطابق مختصر تبصرے کرتا رہا ہے۔ اتفاق سے ڈاکٹر احمر رفاعی کی کتاب ''شعلۂ طور۔۔۔ اشاعتِ اولیں و مابعد'' پر ایک ذرا طویل تبصرہ کیا جسے مرحوم بڑی مشکل سے شائع کرنے پر آمادہ ہوئے، اس میں بعض تسامحات کا ذکر کیا تھا، عام حالات میں ایسی باتوں کو پسند نہیں کیا جاتا مگر ڈاکٹر صاحب نے بڑی فراخ دلی سے اس کا خیر مقدم کیا اور نہ صرف اس پر تحقیق مزید کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ راقم پر ایک مضمون بھی لکھا اور اسے اپنی نئی کتاب میں شامل کر کے میری عزت افزائی فرمائی۔

تجزیے میں خود تجزیہ نگار کو اگر مضمون یا موضوع پر پورا عبور نہ ہو تو کم از کم اس سے خاصی واقفیت ہونا ضروری ہے۔ خامیوں کا اظہار کرتے وقت اس کو یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ وہ خود بھی نشانہ بن سکتا ہے۔ اس لئے عام طور پر لوگ سرسری تجزیہ کر کے اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ یہاں ستائشِ باہمی کا اہم کردار ہوتا ہے۔ ہمارے اکثر ادیب و شاعر ادب کی تخلیق

کے بجائے تعلقات عامہ پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور اس میں گروہ یا حلقہ بندیاں ہی اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتی ہیں۔ ان امور سے قطع نظر تجزیہ نگار اس وقت کافی مشکل میں پھنس جاتا ہے جب وہ موضوع سے متفق ہی نہ ہو۔ ایسی صورت میں اس کو مصنف کے خیال کو دبانے کی کوشش تو نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ایک لحاظ سے تنقیص کی صورت ہے۔ تاہم اس کو اپنی رائے کا اظہار کر دینا چاہئے۔

"پیش رفت انٹر نیشنل" کا یہ نمبر تجزیوں اور تبصروں دونوں پر مشتمل ہے۔ پہلا تبصرہ ڈاکٹر منظور احمد کا ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے کتاب "سر سید احمد خان اور جدت پسندی" (۱) پر ہے۔ سر سید کو ان کی مذہبی تصانیف مثلاً سر ولیم مور کی کتاب کے جواب میں خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن لکھنے کے باوجود ان کی جدت پسندی کے باعث ان کی زندگی میں کفر کے فتوے لگے۔۔۔۔۔ کا خطاب ملا، مولانا جمال الدین افغانی (۲)، والیہ بھوپال نواب سکندر بیگم وغیرہ سے بدگمان کرایا، بلکہ وفات (۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) کے اسی سال تک مسلم امہ کے ایک طبقے نے ان کو قبول نہیں کیا، طرح طرح کے الزامات لگتے رہے، چند سال قبل اورینٹل اسکول لندن کے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھوز نے نیپا کراچی کے جلسے میں ان کو برطانوی گورنمنٹ کی خیر خواہی اور قوم پرستی کے سلسلے میں دورخی کا طعنہ دیا (جس کا جواب وہیں دے دیا گیا تھا)

سر سید کی بازیافت ایک حالیہ عمل ہے۔ اس میں پرویز مرحوم (چند مذہبی تصورات)، مغل الرحمٰن، نئی دہلی کے "ایشین ایج" کے چیف ایڈیٹر ایم۔ جے اکبر (جدت پسندی کی حد تک)، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر محمد علی صدیقی وغیرہ کا ہاتھ ہے۔

دوسرا تجزیہ پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد کے کتابچے "پس چہ باید کرد" پر محترم اختر حامد خان کا ہے۔ جس کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ "ڈاکٹر منظور احمد روشن خیال دانش ور، ابن رشد، سر سید اور علامہ اقبال کے شیدائی، اسلام کو ایک فلسفی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔" (صفحہ ۱۶)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر منظور احمد صاحب فلسفے کے پروفیسر، فکر انگیز خیالات کے مالک اور عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں اسلام کو نہیں بلکہ آج کی مسلم قوم کے اعمال اور افعال کو پرکھنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ وہ نہ تو سر سید کے افکار سے پوری طرح مطمئن ہیں جس کا

اظہار ان کے متذکرہ تبصرے سے ہوتا ہے اور نہ وہ فکرِ اقبال کے تمام گوشوں سے متفق ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے ایک مضمون "اسلامی فکر میں بصیرت کی روایت اور اقبال" کو پیش کیا جا سکتا ہے جو ماہنامہ "نگار پاکستان" کے جنوری ۲۰۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

خان صاحب کی کاوش قابلِ تحسین ہے کہ موصوف نے اسلام کی تیرہ سو سالہ (۱۸۵۷ء تک) تاریخ کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ وہ مغرب کی ترقی میں علم کو ترقی کا سبب قرار نہیں دیتے بلکہ "اس میں توپ، جہاز رانی اور مہاجنی اہم ہیں۔" (صفحہ ۲۷)۔ جہاں تک بارود کے استعمال اور جہاز رانی کا تعلق ہے، مغرب نے یہ چیزیں مسلمانوں ہی سے حاصل کیں۔ مسلمانوں نے تو ابتدا ہی میں جہاز رانی پر گرفت کر لی تھی۔ پندرہ ہجری میں عثمان بن ابی العاص ثقفی کو عمان اور بحرین کا عامل مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اپنے بھائی کو بحرین بھیجا اور خود عمان کا رخ کیا۔ یہ دونوں مقامات بندرگاہیں تھیں جہاں ہندوستان سے جہاز آیا کرتے۔ انہوں نے نہ تو کوئی علاقہ فتح کیا اور نہ کوئی معاہدہ کیا۔ (غالباً یہ Exploratory نوعیت کی مہمات تھیں) تاہم جب حضرت عمرؓ کو علم ہوا تو انہوں نے عثمان کو لکھا کہ "تم نے ۔۔۔ کو لکڑی پر سوار کرا لیا، قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر مسلمان تباہ ہو جاتے تو میں ان کے برابر تعداد تمہارے قبیلے سے لیتا" (البلاذری)۔ ایسا ہی حکم انہوں نے قبرص اور دیبل کی لشکر کشی کے لئے دیا۔ (حضرت عمرؓ کے خطوط، خط نمبر ۳۱۲، صفحہ نمبر ۲۲۰)۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرت امیر معاویہ نے پہلی مرتبہ قبرص فتح کیا۔ (البلاذری ۱۵۹)۔ دوسری صدی ہجری کے ابتدائی دور میں طارق بن زیاد وہاں پہنچے اور وہاں امویوں کی حکومت قائم ہوئی۔ کئی صدیوں تک بحیرہ روم پر مسلمان جہاز رانوں کا راج رہا۔ ۱۴۰۲ میں تیمور نے باسفورس پر قبضہ کر لیا۔ روایت یہ بھی ہے کہ کولمبس کے ساتھیوں میں ایک مسلمان ملاح بھی شامل تھا۔ مسلمان ملکوں میں وسائل کی کمی نہیں، علم کی کمی ہے۔ جس کی وجہ سے اغیار ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ سعودی عرب کے تیل کے چشموں پر آرامکو اور قطر کے ذخیروں پر یورپی کمپنیاں قابض ہیں۔ طویل بحث کے بعد خان صاحب اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ترقی کی خواہش کے ساتھ ہم کو سرمایہ، علم کے مراکز، محبت کے جذبے اور امن و امان کا بھی اہتمام کرنا ہوگا۔ پھر ڈاکٹر صاحب سے اختلاف کیوں؟

تیسرا اہم تجزیہ محترم ڈاکٹر شان الحق حقی کے بھگوت گیتا کے منظوم اردو ترجمے پر جناب عثمان عرفانی کا ہے۔ جس میں کافی محنت اور وسیع مطالعہ کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب کے ترجمے کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ میں یہ تجزیہ پڑھ کر ششدر رہ گیا کہ اردو کے اتنے بڑے عالم، لغت نگار اور دانشور نے ان قدیم تراجم پر نظر کیوں نہیں ڈالی جن کے حوالے تجزیے میں دیئے گئے ہیں۔ یہ فرض کرنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ ترجمے کا منصوبہ بناتے وقت محترم حقی صاحب ان قدیم تراجم سے ناواقف تھے۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ موصوف نے انگریزی مترجمین کے ترجموں کو زیادہ مستند اور صحیح تصور کیا۔ کیوں کہ عموماً اردو کے مقابلے میں مغربی تحقیق وتنقید کے معیار کو بلند سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال اس فروگزاشت پر خود حقی صاحب ہی زیادہ بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ تاہم عثمان عرفانی صاحب نے بہت سی روایتوں کی تفصیل بیان کر کے قارئین کو بڑی تاریخی معلومات بہم پہنچائیں۔

"پیش رفت انٹرنیشنل" کے دوسرے تجزیے اور تبصرے بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔ محترم شفیق صاحب اس یادگار پیش کش کے لئے لائق مبارک باد ہیں۔

حوالے:

(۱) "پیش رفت انٹرنیشنل" کے تجزیے اور تبصرے۔

(۲) "سرسید ایک تعارف"۔ فکر و آگہی۔ علی گڑھ نمبر صفحہ ۶۱۔

۳) ماہنامہ "نگار پاکستان"، جنوری ۲۰۰۵ء۔

۴) البلازی، باب فتوح السندھ، صفحہ ۱۵۹

۵) "حضرت عمر کے خطوط" خط نمبر ۳۱۲، صفحہ ۴۲۰۔

نوٹ: یہ مضمون مجھے اس وقت ملا تھا جب محترم شان الحق حقی بقید حیات تھے۔ مگر اسے بروقت شائع نہ کیا جا سکا تھا۔ افسوس کہ اس کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے جب وہ ہم میں نہیں۔

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا
ایک عالی دماغ تھا نہ رہا

''کچھ صورت گر افسانوں کے''۔۔۔ایک ناقدانہ تجزیہ

احمد صغیر صدیقی

''کچھ صورت گر افسانوں کے'' رؤف نیازی کی تازہ تر تصنیف کا نام ہے۔ یہ عملی تنقید سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ۳۱ فکشن نگاروں کے فکر وفن کا جائزہ پیش کیا ہے۔ جن افسانہ نگاروں پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے وہ سب کے سب صاحبِ کتاب ہیں۔ ان کی کتابوں میں جتنے افسانے ہیں تقریباً سب کا جائزہ انھوں نے لیا ہے۔ یہ کوئی پانچ سو افسانے ہوں گے۔ یقیناً یہ ایک بے حد مشقت طلب کام کہا جاسکتا ہے۔ ایسا سنجیدہ کام اس سے پہلے شاید ہی کسی نے کیا ہو۔

ہمارے ادب میں ایسی کتابیں تقریباً مفقود ہیں۔ وجہ یہ نہیں ہے کہ فکشن کی عملی تنقید لکھی نہیں گئی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ افسانوں کے تجزیوں کا معاملہ شاعری کے تجزیے سے بہت مختلف ہے۔ شاعری کی تنقید پر جب کوئی کتاب آتی ہے تو اسے شوق سے پڑھا بھی جاتا ہے اور سمجھا بھی جاسکتا ہے۔ ناقد کی رائے سے مکالمہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے پیش کردہ نکات پر غور بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کی باتوں سے متفق بھی ہوا جاسکتا ہے اور کوئی چاہے تو انھیں رد بھی کرسکتا ہے۔۔۔ کیوں کہ ایسی کتابوں میں جو مضامین ہوتے ہیں، ان میں پہلے پورا شعر یا غزل یا نظم لکھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ناقد اس کا تجزیہ پیش کرتا ہے، ان کی تشریح وتوضیح کرتا ہے۔ ان کے محاسن اور خامیوں کو زیر بحث لاتا ہے اور پھر فن پارے کا ادب میں مرتبہ ومقام کا تعین کرتا ہے۔ پڑھنے والا با آسانی ناقد کی لکھی باتوں کو اصل شعر یا نظم کے تناظر میں دیکھ لیتا ہے اور پھر وہ ناقد کی رائے کو بہتر طور سے سمجھ سکتا ہے۔ اس سے اتفاق واختلاف کرسکتا ہے ۔۔۔ مگر افسانوں کے تجزیاتی مضامین میں یہ بات نہیں ہوتی۔۔۔ ہم کسی بھی افسانے پر کسی کی رائے کو صرف اسی وقت درست یا غلط قرار دے سکتے ہیں جب ہم نے وہ افسانہ خود بھی پڑھ رکھا ہو۔ اور وہ ہمارے سامنے موجود بھی ہو۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ فکشن کی عملی تنقید کی کتابیں نہیں دکھائی دیتیں۔ فکشن کی عملی تنقید پر مبنی کوئی کتاب قاری کو صرف اسی وقت متوجہ کرسکتی ہے جب قاری نے زیر بحث افسانوں کو پڑھ رکھا ہو۔ اس قسم کی کتابوں کی حیثیت کا تعین ہو بھی نہیں سکتا جب تک کتاب میں پہلے وہ افسانہ نہ چھاپا جائے جس پر بات کی گئی ہو۔

رؤف نیازی کی کتاب میں ایسا کوئی اہتمام نہیں اور یہ ممکن بھی نہ تھا کہ ہر مضمون کے ساتھ وہ افسانہ نگار کا سارا مجموعہ بھی منسلک کرتے۔۔۔اس لحاظ سے اس کتاب کی افادیت عام قاری کے لئے وہ نہیں رہی جوان افسانہ نگاروں کے لئے ہوسکتی ہے جن کی تحریروں کے بارے میں رؤف نیازی نے لکھا ہے یا جنھوں نے وہ افسانے پڑھ رکھے ہیں جن پر اس کتاب میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

میں اپنی اس بات کو تھوڑا مضبوط بنانے کے لئے کچھ مثالیں دینا چاہوں گا۔

نسیم سترکھی کے افسانوں کے مجموعے میں شامل افسانوں پر بات کرتے ہوئے رؤف نیازی لکھتے ہیں:

> ''افسانہ ''غبارہ'' میں فلسفہء قربانی اور دوسرے افسانے ''قشقہ'' میں مذہبی خوش عقیدتی کو موضوع بنایا گیا ہے۔''غبارہ'' اپنی کاوش میں اس لئے ناکام دکھائی دیتا ہے کہ جس بیانیے کو وہ توڑنا چاہتا ہے اس کے لیے وہ ایک دوسرے بیانیے کو استعمال کرتا ہے۔یعنی ایک کی برخواستگی دوسرے کی آمد سے ہوتی ہے۔ایک باہر نکلتا ہے تو دوسرا اندر آجاتا ہے۔پھر بیانیے میں موجود تضادات اور الزامات غیر منطقی اور غیر استدلالی ہیں۔
>
> البتہ ''قشقہ'' ایک کامیاب کوشش ہے۔'قشقہ' ارادت مندوں کو بے عملی کے جال سے نکلنے کی راہ بجھاتا ہے۔''

اگر آپ نے نسیم سترکھی کے یہ دونوں افسانے نہیں پڑھے ہیں تو کیا آپ مصنف کی لکھی باتوں کو مان لیں گے؟اور نہیں مانیں گے تو اس قسم کی کنٹری کو آپ پڑھنا پسند کریں گے؟ آپ نے اسے پڑھ بھی لیا ہے تو کیا سمجھیں گے؟

یہاں پر میں یہ واضح کردینا بھی چاہوں گا کہ یہ کتاب افسانے کے سامنے نہ ہونے کے باوجود بھی کسی حد تک پر افادہ ہوسکتی تھی اگر ناقد نے مثالوں سے بتایا ہوتا کہ اس نے کوئی بات کیوں کہی؟ مثلاً اب اسی افسانے ''غبارہ'' کے حوالے سے جب اس نے یہ سطور لکھیں کہ افسانہ نگار جس بیانیے کو توڑنا چاہا اس کے لئے دوسرا بیانیہ استعمال کیا اور اس کی یہ کوشش افسانے کی ناکامی کا سبب بنی تو اسے قاری کو دونوں بیانوں کے کچھ خدوخال سے آشنا کرانا چاہئے تھا۔اسی طرح جب اس نے لکھا کہ بیانیے میں تضادات ہیں اور استدلال نہیں تو کچھ نقشہ اس کا بھی افسانے سے اقتباس کی صورت میں یا کسی اور طرح قاری کو

ضرور دکھانا چاہئے تھا۔۔۔ پوری کتاب میں جا بجا یہی صورت ملتی ہے۔ ناقد کمنٹری کرتا ہوا چلتا دکھائی دیتا ہے۔ مگر وہ قاری کے لئے کوئی ایسا مواد سامنے نہیں لاتا کہ وہ ناقد کی کمنٹری کی صداقت کو پرکھ سکے۔

یہاں اس اعتراض کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس قدر "طوالت" کا اہتمام کیا جاتا تو پھر یہ کتاب کئی ہزار صفحات کی ہو جاتی۔ جواباً میں کہنا چاہوں گا کہ یہ طوالت ہی کتاب کو افادیت دیتی ہے۔ موجودہ صورت میں کتاب کا۔۔۔ ایک بڑا حصہ Abortive لگتا ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے یہ بات بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ مصنف نے اپنی پوری طاقت غیر متعلقہ کتابوں کے مطالعے اور غیر ضروری مواد کو سمیٹنے میں صرف کر دی ہے۔ جن کا افسانے کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

۱) "فرد کا وجود اس کے جوہر سے جلا پاتا ہے۔ اور فرد بقول سارتر اپنے جوہر کی تخلیق میں آزاد ہے۔ شمشاد احمد نے اپنا آپ افسانے کے توسط سے منوایا۔"

۲) "شمشاد احمد نے اپنی دیگر صلاحیتوں کے گرد ممنوعات کا حصار کھینچ کر افسانوں کے بے شمار پل تعمیر کیے...... یہ پل اس کے Being in the world کا ثبوت ہیں۔ لفظوں کے ان پلوں کی اہمیت اگر آپ مارٹن ہیڈگر سے پوچھیں تو وہ بتائے گا کہ زبان وجود اور کائنات کے درمیان وہ واحد رابطہ ہے جو اپنے ادراک...... کے لئے ازبس ضروری ہے۔......"

۳) "زیر بحث افسانے کا مرد (طاہر نقوی کا افسانہ 'بلندیوں کی چیخ') جب عورت ذات سے مردانہ وارفتگی اور پیش رفت کا خواہش مند نظر آنے لگا تو یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس میں مطلوبہ مردانہ جنسی ہارموز کم ہیں۔ یونگ مردانہ ہارموز کو Anima اور زنانہ ہارموز کو Animus میں تقسیم کرتا ہے۔"

دیکھئے مثال نمبر ۱ میں سارتر کا قول۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟ شمشاد صاحب نے جو اپنے آپ کو افسانے کے جوہر سے منوایا، کیا اسے بتانا بلا سارتر کی بیساکھی کے ممکن نہ تھا؟ مثال نمبر ۲ میں مارٹن ہیڈگر کو بلاوجہ گھسیٹا گیا ہے۔ مثال نمبر ۳ میں یونگ کے ارشادات سے بھی بلاوجہ نوازا گیا ہے۔ یہ تنقید نہیں اسے

کہتے ہیں Pedantry۔

Pedantry کے ان مظاہروں سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔ان کی یہ کوشش افسانوں کی تفہیم میں جس طرح ڈالی گئی ہے اسے بھی محض Irrelevant ہی کہنا پڑے گا۔مگر ایک بات ضرور ہے کہ اس سے قاری کو تھوڑی بہت معلومات ضرور مل جاتی ہیں جس کے بعد وہ ناقد سے اس بات کا شاکی ہونے کے باوجود کہ اس نے افسانے سے بات نہیں کی اس کا تھوڑا سا شکر گزار ہو جاتا ہے کہ چلو تنقید نہ سہی کچھ دوسری معلومات ہی ہاتھ آ گئی ہیں۔رؤف نیازی کے تقریباً ہر مضمون کی توند بہت سا غیر متعلق علم ہوا کی طرح بھرا نظر آتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ انھوں نے افسانوں پر روشنی ڈالنے کے لئے فلسفے،لسانیات،مائتھالوجی اور نفسیات وغیرہ کی کتابوں سے تو مدد لی ہے مگر فکشن کی تنقید کی مستند کتابوں سے وہ رجوع کرتے نہیں دکھائی دیتے۔نتیجتاً ان کے ہاں ہمیں ایسی بہت سی باتوں کا طومار نظر آتا ہے،جن کا تعلق نفس مضمون سے اتنا نہیں ہوتا جتنا نمائشِ علم سے۔آیئے کچھ مثالیں اس کی بھی دیکھ لیں۔

رؤف نیازی طاہر نقوی کے افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”نیوراتی خوف کی مظہر ایک اور کہانی ”اجنبی خوف کی دستک“ ہے۔اس قسم کی تشویش Free floating anxiety کہلاتی ہے۔اس عارضے میں مریض کسی معقول وجہ کے بغیر ہر وقت ایک خوف کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔“

بس یہ تجزیہ ہے اس کہانی کا۔اس میں انھوں نے صرف اپنے علم کی نمائش کر دی ہے۔کہیں نہیں بتایا کہ طاہر نقوی کا افسانہ ان فنکارانہ محاسن کا حامل تھا بھی یا نہیں جو اس نوع کی خامہ فرسائی کو حق بجانب ٹھہرانے کے موجب بنتے ہیں۔البتہ آپ کو یہ ضرور بتا دیا ہے کہ یہ فری فلوٹنگ اینگزائٹی کیا ہوتی ہے(اور دوسرے لفظوں میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ انھیں معلوم تھی)

ڈاکٹر زاہد حسین کے ایک افسانے سے مندرجہ ذیل اقتباس دینے کے بعد رؤف نیازی کی نمائش علم دیکھئے:

> ”نرگس کے پھول نے پانی میں عکس دیکھا تو اپنے حسن پر نازاں ہوا اور جھومنے لگا۔“

اب دیکھئے رؤف نیازی کیا لکھتے ہیں:

"گویا وہ یہ یاد دلاتا ہے کہ نارسی سس نے ایسے ہی وجود کا وہ حصہ دیکھا جو
ینگ کی اصطلاح میں Animus کہلاتا ہے۔قدیم اساطیر کے مطابق
ہندو دیومالا میں شیو یونانی میں ہرما فروڈائٹ اس کی واضح مثال ہیں جہاں
مرد وعورت میں کوئی فرق نہیں............"

اب اس کتاب کے ایک اور پہلو کو دیکھئے۔ کتاب میں ناقد نے بہت سے افسانوں پر صرف چند سطروں کی رائے دی ہے اور کہیں افسانوں کا پہلے خلاصہ دیا ہے اور پھر اس پر بحث کی ہے۔ یہ طریقہ یعنی خلاصہ دے کر لکھنے کی بات اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ قاری کو کم از کم افسانے کے موضوع سے تو آگاہی ہو ہی جاتی ہے۔ اسی طرح وہ کہانی کو بھی کسی قدر سمجھ لیتا ہے۔ یہ باتیں اس میں دلچسپی پیدا کرتی ہیں کہ وہ ناقد کی رائے بھی پڑھے۔ یعنی وہ خلا میں نہیں رہتا جہاں صرف ناقد بولتا نظر آتا ہے۔ باقی کچھ اس کے حواسوں کے احاطے میں نہیں ہوتا۔ لیکن خلاصے کا سلسلہ بھی جا بہ جا ٹوٹتا ہوا ملتا ہے۔ یعنی وہ پورا خلاصہ بھی نہیں دیتا۔۔۔ اس طرح ناقد پورے اور ادھورے خلاصوں کے بعد تشریحات اور محاکموں کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔۔۔ آخر میں مصنف نے بہت سے افسانوں اور افسانہ نگاروں کے بارے میں فتوے صادر کیے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو قابل اعتراض ہو۔ افسانوں کو پڑھ کر اپنی رائے ہر شخص دے سکتا ہے۔ مگر کتاب کے مصنف نے جس قسم کے فتوے دیئے ہیں وہ ضرور قابل توجہ ہیں۔

بعض جگہوں پر تو اس نے جوشِ تحریر میں پورے اردو ادب کی طرف سے اسٹیٹ منٹ جاری کر دیا ہے۔ دیکھئے:

۱) "......نتیجتاً اردو ادب "شناخت" اور "دعا" جیسے افسانے لکھنے والے کی صلاحیتوں سے پوری طرح مستفیض نہ ہو سکا۔"

۲) "اردو فکشن کی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔"

۳) "آنے والا وقت اس کا نام جمہوریت کے بنیاد گزار قلم کاروں کی فہرست میں لکھے گا۔"

۴) "وہ دورِ جدید کا جدید افسانہ نگار ہے۔ افسانوی ادب کی تاریخ میں اسے نمایاں مقام حاصل ہے......" وغیرہ۔

اکثر جگہ ناقد نے افسانہ نگاروں کے فکر و فن پر جو حتمی رائے دی ہے، وہ بھی ایک خود فراموشی کے

عالم میں دی گئی نظر آتی ہے۔اس طرح کے جملوں کا اطلاق دنیا بھر کے تمام اچھے برے افسانہ نگاروں کے افسانوں پر ہوسکتا ہے۔دیکھیے:

۱)''ان کا ہر کردار انسانی زندگی کے کسی نہ کسی مخفی گوشے کی رونمائی کرتا نظر آتا ہے۔''

۲)''ان کا فن پارہ اپنی خود مکتفی حیثیت میں اپنے اظہار یعنی زبان کی ساخت کی وجہ سے ایک سچائی خلق کرتا نظر آتا ہے۔''

۳)''......کے افسانے اس اعتبار سے ہر فرد اور سماج کی پوری ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔''

اس کتاب میں ناقد کی افتادِ طبع بھی بڑے دلچسپ انداز میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔کبھی انھیں سادہ بیانی بہت دل کو بھاتی ہے اور اسی وصف میں غرق ہو کر انھوں نے افسانہ نگار کے سر پر دستارِ فضیلت باندھ دی ہے۔

۱)''وہ ہم نفسوں کے جذبات واحساسات کو سیدھے سادے لفظوں میں غیر ضروری جزیات نگاری کے بغیر اس فنکاری سے پیش کرتا ہے کہ وہ قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔''

۲)''وہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو سادگی کے ساتھ تاثرات میں ڈھالنے کا فن جانتی ہے۔''

تاہم یہی سادگی جو کسی کسی کے ہاں بہت دلپذیر لگی ہے وہی سادگی ایک دوسرے افسانہ نگار کے ہاں انھیں افسانے کا دو سو سالہ پرانا فریم ورک نظر آتی ہے۔۔۔جبکہ اسی افسانہ نگار کے اسی دو سو سالہ پرانے فریم ورک میں لکھے ہوئے ایک افسانے میں انھیں خیال وفکر کی ایک نا مختتم کہکشاں بھی پھیلی نظر آتی ہے اور اس کے چند ایک افسانے انھیں معرکتہ الآرا بھی محسوس ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنے مضمون میں سو سال پرانے فریم ورک کی کوئی نشاندہی نہیں کی کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ بتا دیتے تو قاری کے علم میں اضافہ ہو جاتا۔

ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

"اگر وہ (افسانہ نگار) زندگی کی لحہ بہ لحہ بدلتی سچائیوں کے بطون میں اترنا چاہتا تو اس کا مشاہدہ اس کی تخلیقات میں ان گنت رنگ بھر سکتا تھا......"

یہ ہے اس تنقید کا نمونہ جو آپ کی کتاب میں بہت جگہ ملے گا۔ اس کتاب کے مصنف کا المیہ یہ ہے کہ وہ تنقید کی موٹی کمر کو جب بھی پکڑنے کی سعی کرتا ہے وہ اس کے ہاتھ سے پھسل جاتی ہے۔ اس عالم میں بس وہ بساط بھر تنقید سے چوما چاٹی کر کے کھسک لیتا ہے۔ وہ نظریات کا زندانی نظر آتا ہے۔ جا بہ جا فن اور فنکار کو توڑ مروڑ کر نظریے کے فریم میں ٹھونس دیتا ہے۔ مثال دیکھئے:

"اس نے زندگی کی ظاہری پرت کو جس طرح دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے اسے اسی طرح گہرائے بغیر افسانے کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس نے تخلیقیت کے لئے دو سو سالہ فریم ورک اپنا کر نہ صرف یہ کہ خود کو اس کے اندر بند کر لیا بلکہ اسے اس کی اصابت پر اصرار بھی رہا۔ وگرنہ یہ حقیقت اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں کہ قرۃ العین حیدر ہوں یا امریتا پریتم، راجندر سنگھ بیدی ہوں یا سعادت حسن منٹو یہ سب جب کلیوں اور کلیشوں سے باہر نکلے تو امر ہوئے......"

یہاں نہ ناقد نے ان کمیوں کی نشاندہی کی ہے نہ کلیشوں کی جن میں بقول اس کے افسانہ نگار قید ہے۔ نہ ہی انھوں نے یہ بتایا کہ "زندگی کی ظاہری پرت کو کس طرح گہرایا جاتا ہے۔ نہ ہی انھوں نے یہ زحمت گوارا کی کہ چند اقتباسات ہی نقل کر دیتے کہ دیکھیے اس میں یہ سب کچھ نظر آ رہا ہے۔

جہاں انھوں نے تعریف کی ہے وہاں بینگن کو بھی رنگ کی وجہ سے کرشن مراری کہا ہے اور جہاں وہ کسی کو Under rate کرنے نکلے ہیں وہاں انھوں نے پتھر مارنے کے لئے پہاڑ توڑنے کی کوشش کی ہے۔ دونوں صورتوں میں خود ناقد موصوف کا نقصان نہیں ہوا ہے کیوں کہ ان کے پاس اپنے خیالات کی پونجی بہت کم ہے۔ نقصان صرف تنقید کا ہوا ہے۔ تنقید کا موضوع وہ آبدار موتی ہے جو غواصی کے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جوہری کی طرح نقاد اس کی پرکھ کرتا ہے۔ یہی پرکھ اس کی تنقیدی قابلیت کی کسوٹی ہوتی ہے۔ یہ پرکھ تب ہی سچی ہوتی ہے جب ناقد نے واقعی فن پارے کو درست طرح سمجھا ہو اور اس کے حسن و قبح کو مس کیا ہو۔

رؤف نیازی نے اپنی کتاب میں کثرت سے تنقید کی جگہ تشریح کا کام انجام دیا ہے اور اسی کو تنقید

سمجھ بیٹھے ہیں۔ وہ افسانوں کے ریوڑوں کو ہنکاتے ہوئے کچھ اس طرح بولتے نظر آتے ہیں کہ یہ بھیڑ کالی ہے، اس کے بال سفید ہیں، وہ بھیڑ موٹی ہے وہ بھیڑ دبلی ہے۔ افسانے کا موضوع بتانے سے تنقید کا کام مکمل نہیں ہوتا۔ افسانے بھیڑیں نہیں ہوتیں ان کے بالوں کا رنگ بتانے سے تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا۔

اس کتاب میں مجھ ناچیز کے افسانوں کے مجموعے پر بھی مصنف نے اظہار خیال کیا ہے۔ اپنے مضمون میں میرے تمام افسانوں پر مختصراً نظر ڈالی ہے۔ ان افسانوں میں سے زیادہ تر کو انھوں نے جس طرح سمجھا ہے، اسے پڑھنے کے بعد مجھے ان تمام آرا کے بارے میں شدید شک وشبہ پیدا ہوگیا ہے جو انھوں نے دوسروں کے ان افسانوں کے بارے میں دی ہیں جو میرے پڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ جس طرح انھوں نے میرے افسانوں کو سمجھا ہے اگر انھوں نے دوسروں کے افسانوں کو بھی اسی طرح سمجھا ہے تو پھر مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہوگا کہ ان کا شعورِ افسانہ قابل اعتبار نہیں۔

اب میں آپ کو کتاب سے مثالیں نکال کر دکھاؤں گا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے میرے پاس ثبوت موجود ہے۔

میرا ایک افسانہ ہے۔ پہلے اس کا خلاصہ پڑھ لیں۔

ایک سگریٹ فروش مقررہ قیمت سے ہمیشہ زیادہ قیمت وصول کرتا ہے۔ ایک مرتبہ وہ غلطی سے دس کے نوٹ کو پچاس کا نوٹ سمجھتے ہوئے گاہک کو (جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے) بیالیس روپے واپس کردیتا ہے۔ گاہک اسے سابقہ خریداریوں میں زیادہ ادا شدہ رقم کا ازالہ قرار دے کر جیب میں رکھ لیتا ہے۔ آگے جاکر وہ ایک بس میں سفر کرتا ہے اور ٹکٹ کی رقم دبالیتا ہے۔ اس لئے کہ اس بس کا کنڈکٹر بہت بدسرشت آدمی تھا۔ بس میں وہ ایک آٹھ سالہ ٹافی فروش بچے کی ٹافیوں کا پورا مرتبان خرید لیتا ہے اور اسے پچاس روپے کا نوٹ دے دیتا ہے۔ مگر ٹافیاں نہیں لیتا۔ اسی طرح بس میں جب ایک ضعیف آدمی کو کھڑا دیکھتا ہے تو اس کے لئے اپنی جگہ خالی کردیتا ہے...... اس کے یہ تمام اچھے عمل لوگوں کو عجیب محسوس ہوتے ہیں اور وہ اسے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ عجوبہ رہا ہو۔

آپ نے افسانے کا خلاصہ پڑھ لیا ہے۔ یہ کوئی ایسا افسانہ نہیں جو کوئی بھی وضاحت چاہتا ہو۔ اس میں دراصل آدمی کے کردار کی Duality (دوہرے پن) کو پورٹرے کیا گیا ہے۔ وہ کبھی نیکی کے کاموں میں پیش پیش نظر آتا ہے، کبھی بہت ادنیٰ قسم کی حرکات کے ذریعہ خود کو قعرِ مذلت میں گراتا رہتا ہے۔ اور اپنی ہر غلط حرکت کو بھی حق بجانب قرار دینے کے لئے ہر بار کسی ارفع نظریئے کی اوٹ لیتا رہتا ہے۔ اس کہانی

کا عنوان بھی اسی لئے ''عجوبہ'' تھا۔

اب اس افسانے کی اس تفہیم کو دیکھیں جو رؤف نیازی نے کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''۱) افسانے کے اس مرکزی کردار کا رویہ خودنمائی کی غمازی کرتا ہے۔

۲) بس میں وہ اپنی جگہ ضعیف آدمی کو بٹھا دیتا ہے۔ یہاں بھی لوگ اسے گھور کر دیکھتے ہیں۔ اس طرح یہ نیکی کا عمل، ہمدردی کا جذبہ اور اپنی ذات کو نمایاں کرنے کا فعل زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

۳) سگریٹ فروش کی گراں فروشی اپنی جگہ، اس سے زیادہ رقم لینا کون سی شریعت میں جائز ہے؟

۴) پھر ایسی رقم سے ٹافی بیچنے والے بچے کی مدد کون سی دریا دلی ہے؟''

بس ان سطور کے بعد انھوں نے افسانے پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ مطلب صاف ظاہر ہے کہ چونکہ افسانہ نگار نے جو کردار پینٹ کیا ہے وہ ان کے اخلاقی معیار کے مطابق متحرک نہیں تھا لہٰذا افسانہ بے حیثیت ہے۔ اس لائق بھی نہیں تھا کہ اس کی برائی کے لئے ایک دو جملے لکھے جاتے۔

اب میں آپ سے چاہوں گا کہ آپ مجھے بتائیں کیا افسانوں کو اسی طرح پرکھا جاتا ہے؟ رؤف نیازی نے جس طرح افسانے کو سمجھا ہے اس سے صاف لگتا ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت شاید وہ غائب دماغی کی کیفیت میں تھے۔ ان کی سمت سے اس قسم کی فاش غلطی کا کوئی دوسرا جواز میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ میرے دو دوسرے افسانوں ''منقسم'' اور ''قاتل'' کو بھی سمجھنے میں ان سے اسی طرح کی چوک ہوئی ہے۔

افسانے میں کسی غنڈے کی کہانی ڈالی گئی ہو تو اس کی تنقید اس طرح نہیں لکھی جاتی کہ جناب یہ کہانی ایک غنڈے کے بارے میں ہے۔ ایسے برے آدمی پر لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ افسانے میں اصولاً کسی مولانا کو ہونا چاہئے تھا وغیرہ۔ ناقد کا کام ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے جو کچھ بھی لکھا ہے بس اسے دیکھے۔ دیکھنا ہوتا ہے اس نے جو کچھ لکھا ہے کیوں لکھا ہے؟ کیا اس نے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے؟ کیا افسانہ اپنی ٹوٹلیٹی میں فن کے معیار کو چھو رہا ہے یا نہیں؟ کیا اس نے تمام فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر وہ بات قاری تک پہنچائی ہے جو وہ Convey کرنا چاہتا تھا؟ کیا وہ اپنے قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب رہا ہے؟ کیا افسانہ اپنے زبان، موضوع، ٹریٹ منٹ اور بیان کے اعتبار سے اس خانے

میں رکھا جاسکتا ہے جہاں ہماری زمین کے اعلا افسانوں کے نمونے رکھے ہوئے ہیں؟ کیا اس میں وہ آگ ہے جو ہر پڑھنے والے کو گرما سکے؟ یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ناقد زیر بحث لاتا ہے۔ وہ اس قسم کی مضحک باتیں نہیں لکھتا کہ آخر افسانے کے کردار نے رات میں اٹھ کر صرف پانی کیوں پیا' مینگو جوس کیوں نہیں پیا جو اس کے پاس موجود تھا۔۔۔ کردار اگر زخمی تھا تو کھانسا کیوں۔ اسے تو کراہنا چاہئے تھا وغیرہ۔ آپ دیکھ لیں افسانہ "عجوبہ" پر رؤف نیازی کی تنقید کیا اسی طرح کی نہیں ہے؟ اور کیا تنقید اسی طرح کی جاتی ہے۔

افسانہ "عجوبہ" ایک Story of character ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے جو اپنی سرشت میں شیطان بھی ہوتے ہیں، رحم دل بھی۔ اس میں معاشرے کی کئی برائیوں کو بھی مختصراً پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً یہی کہ کسی کے نیک عمل کو بھی یہ معاشرہ اس طرح گھورتا ہے کہ جیسے یہ کوئی عجیب بات ہو۔ رؤف نیازی صاحب نے جو کچھ لکھا اس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ انھوں نے اس افسانے کی کسی ایک چیز کو بھی نہیں سمجھا۔ ایسے میں ان کے لکھے ہوئے اس جملے کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

"اس نے زندگی کی ظاہری پرت کو جس طرح دیکھا اسے اسی طرح
گہرائے بغیر افسانے کے قالب میں ڈھال دیا۔"

رؤف نیازی سطح کی بات تو سمجھتے نہیں۔ اسے سمجھے بغیر گہرائی کی بات کرتے ہیں اور اسی سطح پر ڈوب جاتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں موٹے موٹے خیالات کے رسے، میخیں اور ہتھوڑے ٹھونک ٹھونک کر افسانوں پر اس طرح چڑھتے نظر آتے ہیں جیسے وہ کوئی چٹان ہو۔ دو آنکھوں سے وہ جو کچھ بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں، نہیں دیکھتے، اور شنکر سے تیسری آنکھ ادھار لینے چل پڑتے ہیں۔ مثال دیکھئے:

مسرت افزا روحی کے متعدد افسانوں کو ایک ہی ہلے میں ٹھکانے لگاتے ہوئے رائے دیتے ہیں:

"یہ سب کردار بے بنیاد خود ترحمی کے شکار نظر آتے ہیں۔ رسکن اسے
Pathetic Fallacy کہہ کر مسترد کرتا ہے۔"

ہمارے رؤف نیازی صاحب رسکن سے کچھ کم تو نہیں لہٰذا اسی کی طرح انھوں نے بھی ایسے تمام افسانے مسترد کر دیے ہیں جن میں خود ترحمی کے شکار کردار تھے۔

روحی کا ایک افسانہ ہے "چلڈرن آف پیراڈائز"۔ اس میں ایک عورت کا قصہ ہے، جو پاکستان سے یروشلم جاتی ہے۔ جہاں اس کا شوہر اخبار کی رپورٹنگ کے لئے گیا تھا۔۔۔ "مجھے دراصل خوف و

دہشت کے عذاب پر ایک میورل بنانا تھا۔ جب آصف اپنے اخبار کی رپورٹنگ کے لئے یروشلم آ رہا تھا تو میں بھی زبردستی اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔۔۔ یہ عورت کرائے کے ایک فلیٹ میں رہتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک عورت سے ہوتی ہے جو برابر کے فلیٹ میں رہتی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ ایک بچہ چار سال کا ہے اور دوسرا سات سال کا۔ بچوں کا باپ فلسطین کی آزادی کی تحریک میں جام شہادت نوش کر چکا ہے۔ جب کرفیو لگتا تھا تو یہ دونوں بچے عورت کے پاس آجاتے تھے اور کھیلتے تھے۔ ایسے میں وہ اکثر سڑک کی سمت کھلنے والی کھڑکی سے لگ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جونہی انھیں کسی ٹینک یا گاڑی گزرنے کی آواز سنائی دیتی تھی وہ پیپر ویٹ وغیرہ ڈھونڈنے لگتے تھے۔ انھیں اسرائیلیوں سے شدید نفرت تھی۔ ایک روز کرفیو لگا۔ چھوٹے بچے نے چاکلیٹ کی ضد کی جو ختم ہو چکی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ رپورٹر کی بیوی ان کے گھر پہنچی تو اس نے بچوں کی ماں سے بچے کے رونے کا سبب دریافت کیا۔ ماں نے سبب بتا دیا اور کہا کہ وہ ان کے لئے کیک بنا رہی ہے۔ اس اثنا میں یہ دونوں بچے کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ عورت بچوں کی ماں سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ اسے یاسر عرفات کے کردار سے اختلاف تھا۔ وہ کہتی ہے "زندگی انقلاب کے بغیر ان موسموں کی طرح ہے جن میں کبھی بہار نہ آئے۔۔ تم لوگ اپنے لیڈر کی معیت میں خاک بسر کیوں ہو۔"

بچوں کی ماں جو یاسر عرفات کی دیوانی ہے کہتی ہے۔ "زندگی انقلاب اور صداقت کے بغیر بے معنی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک ہمارے جذبے کی قدر تو کرتے ہیں مگر عملاً ساتھ نہیں دیتے۔"

کچھ دیر بعد کیک تیار ہونے پر وہ بچوں کو پکارتی ہے، مگر جواب نہیں ملتا۔ پھر اچانک گولیوں کی آواز سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ عورت بھاگتی ہوئی سڑک کی سمت واقع کمپاؤنڈ کی طرف جاتی ہے۔ تو اسے کمپاؤنڈ کی دیوار کے ساتھ دونوں بچے گولیوں سے چھلنی ملتے ہیں۔ چھوٹے کے ہاتھ میں چاکلیٹ دبی تھی۔

یہ ایک مختصر افسانہ ہے۔ پہلی قرأت میں اچھا بھی لگتا ہے۔ متاثر بھی کرتا ہے۔ مگر اس میں چند جھول ہیں، جن کے سبب اسے اوسط درجے سے بلند افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ اب ذرا یہ جھول دیکھیں کہ یہ کیا ہیں۔

ا) افسانہ نگار کی کئی باتیں معصومانہ لاعلمی ظاہر کرتی ہیں۔ میورل دیوار پر بنائی گئی بڑی سی تصویر ہوتی ہے۔ یہ عموماً آرٹسٹوں کو آرڈر دے کر بڑے بڑے ادارے اپنے آفس یا عمارتوں میں بنواتے ہیں۔ افسانے کی ہیروئن یہ میورل اس کرائے کے فلیٹ کی دیوار پر بناتی ہے جس میں وہ عارضی طور پر رکی تھی۔۔۔ ہے کوئی

معقول بات؟

۲)افسانے میں جہاں ہیروئن بچے کی ماں سے یاسر عرفات اور فلسطین پر باتیں کرتی ہے وہاں جو مکالے افسانہ نگار نے لکھے ہیں وہ خاصے سطحی اور بے ربط سے ہیں۔

۳) مردہ بچے کے ہاتھ میں چاکلیٹ دبی ملتی ہے۔ کرفیو میں تو کوئی دکان نہیں کھلتی۔ پھر یہ کہاں سے آئی؟ یہ اور اسی طرح کی باتیں افسانے کی مضبوطی کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ یہ تو میرا تجزیہ ہے۔ میں لکھتا تو اسی طرح لکھتا۔

ہمارے نیازی صاحب نے اس افسانے کو کس طرح لپیٹا ہے، اب وہ دیکھئے۔ لکھتے ہیں:

"چلڈرن آف پیراڈائز" فلسطین کی حربی صورت حال کی غماز ہے۔ جس میں دو فلسطینی بچے موت کی وادی میں پہنچ جاتے ہیں۔ تخلیق کار نے فلسطینیوں کے المیے اور عالم اسلام کی بے تعلقی کے حوالے سے بعض سوال اٹھائے ہیں۔"

لیجئے جناب ہو گیا افسانے کا تجزیہ اور کر دیا گیا افسانے کی عملی تنقید کا عمل۔ نیازی صاحب نے جو چند سطور لکھی ہیں، وہ بتانے کی باتیں نہیں تھیں۔ پورا افسانہ ہی اسی پر تھا۔ انھوں نے کون سی ایسی بات کی نشاندہی کی جو قاری کی نگاہ سے اوجھل رہ سکتی تھی۔ کیا بتایا انھوں نے اس افسانے کی ادبی قدر و قیمت کے بارے میں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ تو جناب "کچھ بھی تو نہیں" والی بات اس کتاب میں شامل تقریباً ساڑھے تین سو افسانوں پر صادق آتی دکھائی دیتی ہے۔

اس مضمون میں ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ "نیازی صاحب پتھر مارنے کے لئے پہاڑ کاٹتے ہیں۔ انھوں نے افسانہ "عجوبہ" پر جو تنقید کی وہ اسی کی مثال تھی۔ جس میں انھوں نے افسانے کے مرکزی کردار کے اس عمل پر سخت اعتراضات کئے تھے کہ اس نے سگریٹ فروش کے دیئے ہوئے زائد پیسے کیوں جیب میں ڈال لیے۔ اور کہا تھا کہ یہ کون سی شریعت میں جائز عمل ہے؟ اس لایعنی تنقید پر کچھ کہے بغیر میں اب آپ کو نیازی صاحب کی نظر عنایت کا ایک دلچسپ روپ دکھانا چاہتا ہوں جس سے میری اس بات کی صداقت کا ثبوت ملے گا کہ وہ جب تعریف پر مائل ہوتے تو بینگن کو بھی کرشن کنہیا بنا دیتے ہیں۔ شہناز شورو کے ایک افسانے پر نظر التفات ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس بحث میں جائے بغیر کہ محرمات سے مباشرت یا نکاح کی ممانعت

نیچرل ہے یا کلچرل ایک بات یقینی ہے کہ دنیا بھر میں ایسے واقعات ہوتے
ضرور ہیں۔ تخلیق کار نے سماج کا ایسا چہرہ دکھایا ہے جو ہماری پسند و ناپسند
سے قطع نظر کتنا ہی مکروہ کیوں نہ ہو مگر ہے ضرور۔"

ذرا دیکھیے نیازی صاحب کو خدا کا ذرا سا بھی خوف نہیں۔ کس ڈھٹائی سے افسانہ نگار کی سماجی تصویر کشی کے ضمن میں رطب اللسان ہو گئے ہیں۔ جبکہ دوسری جگہ ایک کردار کی بشری کمزوری پر انھوں نے دیر تک واویلا مچا کر پورا افسانہ اور افسانہ نگار کورد کر دیا ہے۔

آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے یہ باتیں اس لئے لکھی ہیں کہ میں کتاب کے مصنف کی عقل و فہم کی کمی کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے نیازی صاحب نے بہت پڑھا ہے اور نہایت لائق آدمی ہیں۔ مگر یہ ایک بدقسمتی ہے کہ اس کتاب میں وہ مجھے جگہ جگہ اس آئزک نیوٹن کی طرح نظر آتے ہیں جس نے مرغیوں کے ایک جوڑے کے لئے ڈربا بنواتے وقت بڑھئی سے کہا تھا۔۔۔ "ڈربے میں دو دروازے رکھنا۔ ایک اونچا ایک نیچا۔ کیوں کہ مرغے اور مرغی کے قدوں میں فرق ہے۔" پھر جب ڈربا بن گیا اور اس نے آ کر دیکھا کہ اس میں صرف ایک دروازہ ہے تو وہ بڑھئی پر ناراض ہونے لگا۔ بڑھئی نے تسلی سے کہا جناب یہ ایک دروازہ اونچا ہے۔ اس سے مرغی بھی اندر جا سکتی ہے، تب وقت کے عظیم سائنس داں نیوٹن نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑھئی کو دیکھا تھا اور بولا۔۔۔ "واقعی تم صحیح کہہ رہے ہو، یہ بات تو میرے ذہن ہی میں نہیں آئی تھی۔"

بالکل اسی طرح ہمارے نیازی صاحب غبارے کے اندر کا احوال جاننے کے لئے ڈرلنگ مشین کا استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نتیجے میں غبارے کا ربڑ بھی ان کے ہاتھ نہیں لگتا۔ اکثر وہ دور کی کوڑی لانے کے چکر میں سامنے کی باتیں دیکھتے ہی نہیں۔ عمومی باتیں بھی انھیں اوق اور پیچیدہ لگتی ہیں۔ انھیں سلجھانے کے لیے مسلسل ادھر ادھر دیکھتے ہیں اور دوڑ لگاتے رہتے ہیں۔ کبھی ایڈگر ایلن پو کی طرف تو کبھی فریڈن اور وولف کی طرف۔ کبھی اپنے سوالوں کے جواب کے لئے وہ واکر پرسی سے رجوع کرتے ہیں کبھی میری کرافٹ سے۔۔۔ نمونہ دیکھئے:

۱) "۱۸۶۹ میں جان اسٹوارٹ مل نے ایک صنف کی دوسری صنف پر برتری کو دوسری صنف کی غلامی قرار دے کر اسے غیر قانونی کہا۔ "آنکھ سمندر" نامی کہانی میں عورت کے حقوق کی پامالی کا المیہ ہے۔"

۲) ''......کے افسانے کا ننھا کیڑا آنکھ کھولتے ہی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے اور پوچھتا ہے ''میں کون ہوں۔'' کیڑے کا استعارہ انسان کی طرف ہے اور یہ تنہائی ہے جو نطشے کے ہاں Universal lonliness سے عبارت ہے۔''

۳) ''افسانے کی ابتدا ایک چیخ سے ہوتی ہے۔ چیخ ذی حیات کی طرف اشارہ ہے۔ جب بے ہنگم آواز گویائی میں ڈھلتی ہے تو انسان کا تصور واضح ہو جاتا ہے۔ معروف Structurlist زیبتا تودوروف نیریشن Narration ہی کو زندگی سمجھتا ہے۔''

یہ مثالیں دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ جب ایک بہت لمبے آدمی نے زمین پر بیٹھے خربوزہ فروش سے کہا کہ تمہارے خربوزے تو بہت چھوٹے چھوٹے ہیں تو اس نے لمبے آدمی سے کیوں کہا تھا کہ جناب ذرا نیچے بیٹھ کر دیکھیں۔

نیازی صاحب نے اپنے تجزیوں میں جو طریقہء کار اپنایا ہے سارا نقص اسی میں ہے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے جرثوموں کو دیکھنا ہوتا ہے وہاں وہ آنکھوں سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں ان کے سامنے بڑا سا اونٹ کھڑا ہوتا ہے وہاں وہ خوردبین اٹھا لیتے ہیں اور شروع کر دیتے ہیں اس کا حلیہ بیان کرنا۔ جب کہ ان کی ساری توجہ ہوتی ہے دم پر۔

نیازی صاحب نے اپنی اس کتاب میں میری املا کی ایک غلطی پکڑ کر طنز کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''عجوبا''......؟ شاید عجوبہ کی تعجب خیزی میں اضافے کے لئے الف کی طوالت سے کام لے کر قاری کو چونکایا گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں پہلی ہی گیند پر چھکا مارنا......''

خود نیازی صاحب کی اس کتاب میں اسی طرح کی متعدد غلطیاں موجود ہیں۔ جنھیں چھکوں کی ہیٹ ٹرک کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً انھوں نے سیاق و سباق کو ہر جگہ سیاق و سباق لکھا ہے۔ برخاستگی کو برخواستگی، لسانی جمالیات کو لستانی جمالیات وغیرہ۔ ایک جگہ تجسس آمیز یا پر تجسس ابتدایے کے بجائے متجس ابتدایہ رقم کیا ہے۔

اپنی کتاب میں ناقد موصوف نے خامہ فرسائی کرتے ہوئے متعدد جملے بڑے دلچسپ تحریر کیے

ہیں۔ جو فکشن کے کسی نقاد کے قلم سے نکلنے کی وجہ سے قابل غور کہے جاسکتے ہیں۔ مثلاً:

> "......علامت، استعارہ، تشبیہ، تمثیل، رمز و کنایہ سب سے کام لیا ہے۔ مگر ان کی موجودگی اور ناموجودگی ادبی تنقید پر کوئی حکم نہیں لگاتی۔"

بتائیے یہ کوئی معقول فرمان کہا جاسکتا ہے؟......ایک جگہ نیازی صاحب نے لکھا ہے:

> "ان کے زیادہ تر افسانوں کا اسلوب واحد متکلم کی نئی افسانوی تکنک کو اپنائے ہوئے ہے۔"

گویا اگر افسانے میں واحد متکلم کی ترکیب استعمال کی گئی ہو تو وہ تکنک "نئی" ہوگی۔ یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ کتاب میں درج محاکے کسی مستند Criteria کی بنیاد پر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ جا بہ جا انھوں نے اپنی پسند اور ناپسند کو معیار قرار دیا ہے۔

انھوں نے ایک افسانہ نگار غلام محمد کے بارے میں بھی ایک مضمون کتاب میں رکھا ہے۔ بدقسمتی سے یہ نام میرے علم میں نہیں تھا۔ میں اسی لئے اس کے اور باتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تاہم نیازی صاحب نے لکھا ہے۔۔۔ "اس نے اپنا جو پہلا افسانہ لکھا اس میں اس نے جو معیار مقرر کیا تھا اس سے وہ کبھی نیچے نہیں آیا۔ اس میں ارتقا ہوا ہے تنزلی کبھی نہیں ہوئی، اس کی یہ خوبی ایسی ہے جو اسے کرشن چندر اور رام لعل جیسے ممتاز افسانہ نگاروں کے مقابلے میں ممتاز کرتی ہے"۔۔۔ نیازی صاحب کو اب کون بتائے کہ تنقید فن کا محاکمہ ہے شادی کا منڈپ نہیں کہ غالب اور میر کے پہلو میں بٹھا کر کسی کی تصویر کھینچ لی جائے اور فرمادیا جائے کہ یہ بھی انہی کے قد کا شاعر تھا۔۔ بلکہ ان سے بھی ممتاز۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب رُک جانا چاہئے۔ اس کتاب میں بہت سا مواد ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے محاسن و عیوب پر دل کھول کر لکھا جائے تو اس کتاب کے برابر دوسری کتاب بن سکتی ہے۔ مقصود صرف اتنا تھا کہ اس کتاب کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ ہمارے تنقیدی ادب میں یہ کتاب کس طرح کا اضافہ ہے؟ فکشن اور فکشن کی تنقید سے دلچسپی رکھنے والے قاری کیلئے اس میں کیا کچھ ہے؟ پچھلے صفحات کو لکھتے ہوئے میری تمام تر توجہ کتاب کے اس پہلو پر رہی ہے۔ جو اس کا کمزور ترین پہلو کہا جاسکتا ہے۔ اس سے ایک عام تاثر یہ پڑسکتا ہے کہ یہ کتاب غیر اہم ہے۔ اسی لئے میں یہ بتانا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ جلدی نہ کریں۔۔۔ جہاں بہت کچھ اس میں نہیں ہے، وہیں بہت کچھ اس میں ہے بھی۔ مصنف نے اگرچہ بہت جگہوں پر تجزیوں کی غلطیاں کی ہے اور افسانوں کو ٹھیک طرح نہ سمجھنے کی وجہ

سے غلط فیصلے دیئے ہیں یا نتائج اخذ کیے ہیں تو اسی نے اسی کتاب میں چند افسانوں کا بہت عمدہ تجزیہ بھی کیا ہے۔ خصوصیت سے مظفرالدین فاروقی کے بارے میں جو کچھ اس نے لکھ ہے، اسے اس کی ژرف نگاری اور گہری نگاہ کے لئے بطور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

میں کتاب کے دوسرے رخ کو پیش کرنے کا کام اپنے دوسرے ساتھیوں کے لئے چھوڑ رہا ہوں۔ البتہ مختصراً چند باتیں ضرور کہوں گا کہ رؤف نیازی نے جتنا کچھ پڑھا ہے اس کتاب کے توسط سے اسے دوسروں تک منتقل کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ ادب، فلسفہ، سائنس، لسانیات وغیرہ سے متعلق بڑی بڑی علمی شخصیات کے خیالات سے مزیّن ہونے کی وجہ سے بھی اس کی کتاب کی ایک اہمیت بنتی ہے اور اسے صرف اس بنا پر کم نہیں کہا جاسکتا کہ مصنف اپنے اصل موضوع سے اتنا انصاف نہیں کرسکا جو اس کی Demand تھی۔

اس دور میں جب ہمارے ادب کے بہت سے ناقدین مصلحتوں، عصبیتوں اور تن آسانیوں کا شکار دکھائی دیتے ہیں رؤف نیازی نے بلا کسی لالچ کے مختلف مکتبہء فکر کے افسانہ نگاروں کے فکروفن پر قلم اٹھا کر اپنی کشادہ نظری کا ثبوت دیا ہے۔

اگر اس نے افسانہ نگاروں کے زیرِ بحث مجموعوں میں موجود سارے کے سارے ہی افسانوں پر مختصر اظہارِ خیال کے بجائے ان میں سے صرف ایک یا دو افسانوں کا شرح وبسط سے جائزہ لیا ہوتا تو اس کے حق میں اچھا ہوتا۔ موجودہ صورت میں اس کے کام کی افادیت میں کمی ضرور آئی ہے۔ مگر دیئے جلانا ہی اصل عمل ہوتا ہے۔ رؤف نیازی نے اپنے بساط بھر اس عمل میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اس نے کچھ دیئے جلائے ہیں ان میں سے کچھ کی روشنیاں کم یا زیادہ ہوسکتی ہیں۔۔۔۔ لیکن روشنی مدھم ہو یا تیز بہرحال روشنی ہوتی ہے۔

رؤف نیازی کی یہ تصنیف اپنی قسم کا ایک منفرد کام ہے۔ یہ کتاب اس کی مشقت علمی کی آئینہ دار ہے۔ میں نے بھی اس کتاب پر اتنے صفحات لکھنے کی جو مشقت جھیلی ہے وہ بھی اسی لئے کہ مصنف کی محنت کی توثیق میں اپنا حصہ ڈال سکوں جو اس کا جائز حق بنتا ہے۔

خاک میں کیا صورتیں کا ایک مطالعہ/عشرت رومانی

فضا اعظمی نے عصر نو کا ساتھ دے کر مقصدی شاعری میں ارتقا کا عمل جاری رکھا ہے۔ اپنے منفرد لب و لہجے کو جدت اور اختراع کا حامل نا کر با مقصد شعری راستے کا انتخاب کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی اجتماعی ہوتی ہے۔ جس میں ہر فرد و بشر کے لئے ایک بہتر مستقبل کی تلاش اور مسلسل جستجو کی لگن بہت اہم ہے۔ مقصدی شاعری میں عالمی ثقافتوں کے ساتھ تہذیب کا امتزاج بھی ہوتا ہے۔ جس کا دائرہ بین الاقوامی ہوتا ہے۔ اس لئے ایسی شاعری اپنی گہرائی اور گیرائی کے سبب کائنات کا پرتو ہوتی ہے۔ ایسی شاعری میں زمان و مکان کی کی قید نہیں ہوتی' بلکہ اس میں مختلف ادوار اس طرح بغل گیر ہوتے ہیں کہ ماضی، حال اور مستقبل کی یکجائی ہوتی ہے۔

فضا اعظمی نے پہلی طویل مقصدی نظم کلاسیکی انداز میں مخمس کی شکل میں لکھی ''شاعری' محبوب اور فلسفی' جو چوالیس بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظم ان کے اولین مجموعہء کلام ''جو دل پہ گزری ہے'' میں شامل ہے۔ یہ ان کی شاعری کے پہلے دور کی تخلیق ہے۔ یہ وہ دور ہے۔ جس کے بعد بلحاظ شاعری ربع صدی تک وہ خاموش رہے۔ ان پچیس سالوں میں وہ شعر گوئی سے کنارہ کش رہے۔ ایک شاعر کے لئے یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ غالباً یہی وہ زمانہ تھا جس میں بقول ڈاکٹر منظور احمد فضا اعظمی نے اس آگ کو اپنے سینے میں بھرا جو اب ایک آتش سیال کی صورت میں نمودار ہو رہی ہے۔ اس تمہید کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ طویل نظم لکھنے کا رجحان فضا اعظمی کے لئے نیا نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ کلاسیکی شاعری کرنے والے شاعر ہیں۔ گزشتہ دس سالوں میں انھوں نے جو طویل آزاد نظمیں تخلیق کیں یہ ان کے فطری رجحان سے گریز ہے۔ اور غالباً یہ پیرائیہ بیان کسی بہت فعال اور غیر شعوری جذبے کے تحت اختیار کیا گیا ہے۔ ایک ایسا شاعر جو زندگی بھر کلاسیکی شاعری اور بالخصوص غزلیہ شاعری کرتا رہا ہو وہ یکا یک اپنی شاعرانہ زندگی کے تیسرے دور میں آزاد شاعری کی طرف رجوع ہو جائے تو یہ عمل شعوری سے زیادہ الہامی ہی ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں بلا کی غنائیت ہے۔ بہت سے حصے ایسے ہیں جن میں محسوس ہوتا ہے کہ جذبات کے دباؤ میں آ کر وہ تقریباً پابند شاعری کی ہیئت اور تاثیر اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بحر و قافیہ و

ردیف کے لوازمات سے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی (ٹرانسفارمیشن) اتنی فطری ہے کہ قاری کو یہ عمل مشکل سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ آزاد نظم کا مطالعہ کر رہا ہے۔

فضا اعظمی کی جدید ترین کتابی نظم ''خاک میں کیا صورتیں'' مکمل طور پر کلاسیکی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اور مسدس ہے۔ اس نظم کے پہلے دو باب تشبیب کے ہیں۔ حسن کائنات کے عنوان کے تحت شاعر نے لطیف ایمائی اور کنایاتی انداز میں خالق کونین کا شکریہ بھی ادا کیا ہے اور کائنات کی خوبیوں، خوبصورتیوں کی طرف لمحی، اجمالی اشاروں اور تلمیحات کے ذریعہ آفرینش عالم کے رموز کا اظہار موثر طور پر کیا ہے۔ یہ حصے تمام تر ان علامات و کنایات سے مملو ہیں جو مقصد تخلیق کائنات کی وضاحت کرتے ہیں۔

ذیل کے بند سے قاری کو نہ صرف نظم کے اس حصے کا اندازہ ہو جائے گا بلکہ کسی حد تک پوری نظم کے مزاج اور کیفیت کا ایک خاکہ بھی ذہن میں آجائے گا۔

کیا ہے صانع مطلق نے یہ جہاں تعمیر
کہ اس کی ساخت میں مضمر ہے اہتمام کثیر
رواں ہے حسن توازن سے کل نظام حیات
اصول و عدل پہ بنتی ہے کاروبار مسیر
ہوا یہ اذن الٰہی، کہا کہ کن فیکون
اور اس کے ساتھ ہی پیدا ہوا جہان سکون
نہ کوئی نور کا پرتو، نہ کوئی نار ہے
نہ ان میں فرق کوئی عز و اقتدار کا ہے
کہ مرتبے میں بھی ایک ہیں ہو مرد کہ زن
ہر ایک جسم و جسد خاک رہ گزار کا ہے
اسی سے عالم انسانیت دیا ترتیب
یہی بنائے تمدن، یہی رخ تہذیب

فضا اعظمی کی گزشتہ نظم ''آوازِ شکستگی'' کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ بارہ کتابوں پر مشتمل ایک طویل نظم ہے۔ اس حوالے سے زیرِ نظر کتاب ''خاک میں صورتیں'' چودہ کتابوں پر مشتمل ایک طویل نظم پر محیط

ہے۔اس کا ہر باب ایک ایسے موضوع کا احاطہ کرتا ہے جو ایک مستقل موضوع ہے بغور دیکھا جائے تو یہ نظمیں دعویٰ، تنقیح شہادت، دلیل اور تجزیے سے گزر کر آخری مرحلہ یعنی اعلانِ فیصلہ تک پہنچی ہیں۔اس طویل نظم میں جس کا موضوع عورت ہے یہ اہتمام تو واقعی ایک عدالتی مقدمے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

افق سے تا افق پھیلی ہوئی ہے نور کی چادر
گھٹاؤں کی طرح سایہ کناں ہے عدل کا شہپر
ہوائے تازہ سے لہرا رہا ہے پرچم رحمت
حقوقِ نوعِ انساں کی کتابوں کا کھلا دفتر
نگاہیں روبرو! تاریخ انساں کی عدالت ہے
صداقت مدعی ہے اور زمانے کی شہادت ہے

اس عدالتِ عالیہ کے حضور جب شہادت گزارنے کا مرحلہ آتا ہے تو یہ منظر سامنے آتا ہے۔

یکایک چیخ اٹھی اک کفن بردوش صورت سے
محلاتِ عدالت ہل گئے غم کی جراحت سے
یہ مجرم ہے! یہ مجرم ہے! یہ مجرم ہے! یہ مجرم ہے!
کفن بردوش لاشے نے کہا اتمام حجت ہے
مجھے اس نے اپاہج کر کے رکھا قید زنداں میں
پسِ دیوارِ تنہائی حوالات خموشاں میں
صلیبوں پر جلی اک لاش نے اٹھ کر گواہی دی
افق سے تا افق پھیلی عدالت کی دہائی دی
یہ انساں شکل ہے لیکن یہ حیوانوں سے بدتر ہے
اسی نے آگ میرے جسم بے بس میں لگائی تھی
مجھے کہہ کر چڑیل اس نے صلیبوں پر چڑھایا تھا
یہ مجرم ہے! یہ مجرم تھا! یہ مجرم ہے! یہ مجرم تھا!

دیگر مراحل سے گزر کر یہ تاریخی مقدمہ جب تجزیے کے مرحلے پر پہنچتا ہے تو وکیلِ استغاثہ عادلان

مقتدر کے حضور اپنی عرضداشت کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

زوال آدم خاکی کا بانی اک تصور ہے

دروغ بالا رادہ جس کا وحشت ناک محور ہے

بروئے قصہء تخلیق کج بینی و کج فہمی

عوام الناس کی بربادیوں کی وجہِ اکبر ہے

وہ تہمت جو لگائی مرد نے بر گردن عورت

سراسر مسخ کر ڈالی نظام دہر کی صورت

ازل سے ایک ناانصاف دنیا کی بنا ڈالی

جہانِ رنگ و بو میں آتشِ سفاک بھڑکا دی

تعدد اور بدی کے پرچم خونی کو لہرا کر

اصولِ عدل اور اخلاق حسنہ کی نفی کر دی

کیا تقسیم مخلوق خدا کو دو طلابوں میں

کرائی بے حیائی کا مداوا تھا حجابوں میں (ص ۱۸۵)

آخر کار وہ مقام آتا ہے جہاں مشیت ایزدی اپنے ناکام بندوں کو ان کی کم ظرفی اور کم مائیگی کا احساس دلاتی ہے اور تخلیق انسانی کے اعلیٰ وارفع مقاصد وامکانات سے ان کو دوبارہ آگاہ کرتی ہے۔

ہوا کی تیز گامی اور طوفانوں کی بے تابی

سکوں ساحل کا قعر بحر کا ہیجان و طغیانی

خلا میں تیرتے اجسام کی راہوں کی پابندی

شعاع مہر سے ذرات کے مرکز کی سیرابی

رگِ آبِ رواں میں اہتمام کیمیا سازی

تغیر کی جہاں گیری تبدل کی جہاں بانی (ص ۲۰۰)

مقاصد تخلیق اور امکانات، ایجاد و تخلیق کے اس تناظر میں جو نتائج اخذ ہوتے ہیں ان کی نشاندہی فضا اعظمی درج ذیل آخری دو بندوں میں کرتے ہیں۔

نہ ماضی کی حقیقت ہے، نہ مستقبل کی وقعت ہے
نہ حاضر ہے نہ غائب ہے، محض فکری جسارت ہے
نہ قطرہ ہے، نہ دریا ہے، نہ یم ہے اور نہ ساگر ہے
نہ ذرہ ہے، نہ تودہ ہے، نہ کوہِ دیو قامت ہے
یہ بس اک مرحلہ ہے، سلسلہ ہے، اک روانی ہے
بکھر جائے تو ذرہ ہے، پگھل جائے تو پانی ہے
تو اس دنیا کے اندر برتری کی جستجو کرنا
بہ وصف قد و قامت بہتری کی آرزو کرنا
بنائے جنس پر توقیر و عظمت کی ہوس کیشی
بہ فیضِ رنگ و صورت ادعائے آبرو کرنا
رضائے آسمانی، مقتضائے آفرینش کے منافی ہے
نظام و اہتمام آفرینش کے منافی ہے

فضا اعظمی کی یہ طویل مقصدی نظم ان کے نظریوں، بصارت اور فکر کی آبیاری کرتی ہے۔ یہ نظم ان کے شاعرانہ کمال اور ذہنی کاوش کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنی فراست اور ذہانت سیعورت کی عظمت کا تاریخی طور پر تجزیہ کر کے اسے خیر و حق اور امن و آشتی کا پیکر بتایا ہے۔ جس میں رجائیت کی نکہتوں کے ساتھ ساتھ ان کے تصور کی تجسیم بھی ہے۔ فضا اعظمی نے بیسویں صدی میں انسانی تہذیب اور قدروں کی پامالی کا مشاہدہ کیا ہے اور ان کے منہدم ہونے کا عمل بھی دیکھا ہے۔ انسانی رشتوں کی بے حرمتی بھی دیکھی ہے۔ لیکن وہ کبھی بھی کسی مرحلے میں دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ ان کے تخلیقی عمل کا سفر ہر لمحہ جاری رہا۔ انھوں نے وہی لکھا جو صداقت پر مبنی ہے۔ اپنی مقصدی شاعری کے ذریعہ، اپنی قوت متخیلہ کی مدد سے حقیقی قدروں کا اثبات کرتے ہوئے نئی قدروں کو آگے بڑھایا ہے۔ اپنی نظموں میں مقصدی شاعری کی ہئیت اور مواد کے لئے تصدیق اور تردید سے کام لے کر اسے پائیدار کرتے رہے۔ انھوں نے خارجی اسباب اور عوامل کے تصادم سے گریز کر کے زندگی میں حرکت، حرارت اور امید کو جگہ دی ہے۔ اپنی شاعری کے دائروں میں نئے رنگوں سے محسوسات کے ذریعہ زندگی کو ایک عالمی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ جس

کے منظر نامے میں آفاقیت ہے۔ان کی شاعری کسی فرد اور جماعت کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وسعت میں پوری دنیا سمائی ہوئی ہے۔ وہ قنوطیت سے دور ہیں۔ان کے یہاں حوصلہ،عزم اور توانائی ہے۔ان کے ترقی یافتہ شعور نے امروز و فردا سے دبیز پردے اٹھا کر فکری توانائی اور عالمی سوچ کو اپنی شاعری کا نشان امتیاز بنایا ہے۔

فضا اعظمی نے تاریخی تناظر میں عورت کو بہت بلند زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے اور اس پر ہونے والے ظلم اور جبر کے خلاف بھرپور آواز بلند کی ہے۔انسانی ضمیر کو جگانے کی کوشش کی ہے اور اس ترقی یافتہ دور میں عورت کی زبوں حالی کی سچی تصویر پیش کی ہے۔نئی تہذیب کے ہاتھوں میں دکھتے ہوئے خنجر کی نشاندہی کی ہے۔اکھڑتی سانسوں میں عورت کی بے چارگی دکھا کر عالمی طور پر اور بالخصوص اہل مغرب کی تاجرانہ سوچ کے تناظر میں یہ بتایا ہے کہ ہوس کاروں کی منڈی میں عورت کو تعیش کا کھلونا بنا دیا گیا ہے جو زرداروں کی جھولی میں موجود ہے۔اس کے سر پر دودھاری تلوار لٹک رہی ہے۔جس کے مختلف درجات ہیں۔آج کی عورت بدلتے موسموں کی دھند میں تنہا کھڑی ہو کر یہ سوچ رہی ہے کہ وہ کہاں جائے! ایک نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے۔جس کا سبب مغربی معاشرہ ہے۔کم لباس اور ہوس کاری نے پرانے رسم و رواج اور طور طریقوں کو بدل دیا ہے۔جنتِ مغرب ایک سراب ہے۔جس میں عورت تنہا بھٹک رہی ہے۔

اہل مغرب نے عورت کو آزادی کے فسانے سنائے اور روشن خیالی کا سبق دیا۔لیکن ترقی اور روایت دونوں کو مہرہ بنا کر قربان گاہ کی بساط کے حوالے کر دیا۔آج کی عورت روایت کے گھنے جنگل صید برید پا ہے۔

فضا اعظمی نے زیر نظر طویل مقصدی نظم میں تاریخی اور عالمی طور پر عورتوں کے لئے ایک ایسا منظر نامہ تیار کیا ہے جس میں بے شمار مناظر ہیں۔جن کی مدد سے قاری کو موضوع کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ فضا اعظمی کی یہ طویل مقصدی نظم ''خاک میں کیا صورتیں'' ایک بہت ہی قیمتی ادبی اور تاریخی سرمایہ بن جائے گی۔حالی کی نظم مدو جذر اسلام (مسدس حالی) اور علامہ اقبال کی نظمیں ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کی طرح۔

زیر بحث

خان زادہ سمیع الوری۔۔۔ شخصیت وفن

مصنف: اسرار الحق خان زادہ ☆☆ مبصر: رؤف نیازی

ناشر: بزم روح وروان سندھ اور بزم ادب نوشہرو فیروز

زمین جس بیج کو اپنے سینے میں چھپا کر درخت کا روپ عطا کرتی ہے وہ درخت بھی بساط بھر چھاؤں سے زمین کے کلیجے کو ٹھنڈا رکھتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تہذیب انسانی کے سفر میں زمین نے اگر کسی کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر پناہ دی ہے تو اس پناہ گیر نے بھی اس خطہ ارض کو اپنا خون پسینہ ایک کر کے رشکِ چمن بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ یک ایسا ہی فخر نوشہرو فیروز (سندھ) خان زادہ سمیع الوری بھی ہے۔ اسرار الحق خان زادہ نے اپنے ایم۔اے۔ کے تحقیقی مقالے کے لئے خان زادہ سمیع الوری کی شخصیت اور فن کو موضوع بنا کر جہاں ان کی شخصیت اور فن کے اثبات واعتراف سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے وہیں سندھ کے نئے اور پرانے باسیوں کے درمیان محبتوں مفاہمتوں کا پل باندھنے کی بھی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ مقالہ نگار نے نوشہرو فیروز کی بنجر زمین کو بار آور اور شاداب بنانے میں اپنے ممدوح کی علمی، ادبی اور سماجی کاوشوں کو حتی الامکان تاریخی اور تہذیبی حوالوں کے ساتھ اس طرح مربوط و مبسوط انداز میں پیش کیا ہے یہ صرف ایک شاعر، صحافی اور ماہر تعلیم کا تذکرہ نہیں رہا بلکہ یہ نوشہرو فیروز کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ بھی بن گئی ہے۔

خان زادہ سمیع الوری نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی آفاقی فکر کو اپنی شعری فتوحات کا حصہ بنا کر اردو زبان وادب کے فکری دامن کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔ ان کا رنگِ تغزل بھی بہت چوکھا اور نمایاں ہے۔

حادثہ کوئی ہونے والا ہے
آج زنداں میں پھر اجالا ہے
تم میری صداقت کو ترازو میں نہ تولو
یہ فیصلے دنیا میں سردار ہوئے ہیں

نثری تخلیقات میں افسانہ "مخلوط تقدیر نامے" اپنی سماجی حقیقت نگاری اور تاثیر پذیری کی وجہ سے

امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ اسی نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اسرار الحق نے ان کی تخلیقی وغیر تخلیقی فعالیتوں کا مختلف عنوانات کے تحت مفصل جائزہ لیا ہے۔ ان کے کوائف زندگی سے لے کر مشاہیر کی آرا تک شامل ہیں۔ ۱۶۰ صفحے کی یہ کتاب ایک قابل لحاظ علمی وادبی کاوش کے علاوہ معاصرین کی بھی علمی، ادبی اور سماجی عظمت کا غیر جانب دارانہ اور غیر جذباتی اعتراف ہے۔ جو اسے اسی نوع کی دوسری کتابوں سے ممیز کرتی ہے۔

پیش رفت انٹرنیشنل

مدیرِ اعلیٰ: شفیق احمد شفیق ☆☆☆ مبصر: عارف شفیق

پروفیسر اظہر قادری تنقید کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ ایک عرصہ سے وہ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۲ء یا ۷۳ء کے دوران سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جو ادبا و شعرا میرے حلقہء احباب میں شامل ہوئے اظہر قادری انھیں لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

عارف ہوشیار پوری، وفا براہی، روشن علی عشرت، شہزاد منظر، افسر ماہ پوری، اصغر گورکھپوری، رفیع احمد فدائی، استاد صغیر بنارسی، فاتح فرخ، اعجاز غنی، یوسف علی لائق، اختر شادانی، مشتاق شبنم، افضال احمد سید، احمد سعید فیض آبادی، احمد عظیم، بشیر ملاٹھوی، مسعود کلیم اور شفیق احمد شفیق۔ یہ سب احباب علمی وادبی محفلوں کے علاوہ آپس میں ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔ پھر یہ سارے رابطے اور محفلیں بکھر گئیں۔ دہشت گردی اور قتل وغارت گری کو اس شہر کا مقدر بنا دیا گیا۔

شفیق احمد شفیق اظہر قادری کے قابلِ ذکر شاگرد ہیں۔ وہ خود بھی ادب میں اپنی ایک پہچان بنانے کے باوجود اظہر قادری کی شاگردی کے حوالے کو آج بھی معتبر جانتے ہیں۔ اظہر قادری بھی انھیں بہت عزیز رکھتے ہیں۔ میں نے زندگی میں کبھی بھی فرمائشی کلام نہیں لکھا۔ لیکن اظہر قادری اور عارف ہوشیار پوری کی خواہش پر میں نے زندگی میں پہلی بار شفیق احمد شفیق کی شادی کے موقع پر چند تہنیتی اشعار لکھے تھے جو کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے۔

اظہر قادری کی علمی وادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے اور نئی نسل سے متعارف کروانے کے لیے شفیق احمد شفیق نے اپنے سہ ماہی ادبی جریدے ''پیش رفت'' میں اظہر قادری پر ایک خصوصی گوشہ حال ہی میں شائع کیا ہے۔ جس میں علامہ رضا علی وحشت کلکتوی، حمایت علی شاعر، رفیع احمد فدائی، پروفیسر آفاق صدیقی، پروفیسر اقبال عظیم، ادیب سہیل، اختر پیامی، پروفیسر ریاض صدیقی، پروفیسر ہارون الرشید، انور احسن، انور فرہاد، احمد زین الدین، ڈاکٹر زاہد حسین، سید حیات عزیز نقوی، جمال نقوی، شاعر صدیقی،

صبا اکرام، عشرت رومانی، حبیب احسن، مشتاق شبنم، نون جاوید، رؤف نیازی اور ڈاکٹر محمد محسن کے مضامین، آرا اور منظوم خراج شامل ہیں۔

بحیثیت شاعر اظہر قادری کا کلام بھی اس شمارے میں شائع کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اظہر قادری کے دو اہم مضامین ''شو پنہار اور ادبی تنقید'' اور ''سماج میں ادب کا مقام'' بھی شاملِ اشاعت ہیں۔

اس اعتبار سے ''پیش رفت'' کا یہ شمارہ یقیناً اظہر قادری کے فن اور شخصیت کا ایک بھرپور مطالعہ ہے اور شفیق احمد شفیق نے یہ کام بڑے سلیقے سے کیا ہے۔

مدحتِ رسول

مصنف: شاعر علی شاعر ☆ ☆ مبصر: منصور ملتانی

اردو میں نعت گوئی تقریباً سات سو سال سے جاری ہے۔ اس میں مختلف قسم کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ جن میں نمایاں ترین مدینہ سے دوری، حاضری کا شوق اور تڑپ، مقامِ مصطفوی کا بیان، معجزات کا ذکر وغیرہ۔ اس نوع کے بہت سے دوسرے مضامین اشعار میں ڈھالے گئے ہیں۔ مگر آج کل مزید خوشی اور تسلی کا باعث یہ ہے کہ شعرا کرام نے نعت کو بیانِ سیرتِ رسول کے ذریعہ تبلیغ سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اور زیرِ نظر مجموعہ نعت میں یہی بات آپ کو بہت سے اشعار میں محسوس ہوگی ۔

وہ چلے سنت پہ ان کی بالیقین

جس کو سیدھی راہِ جنت چاہیئے

پروردگار کی وہ نظر میں ہے معتبر ؛ اپنائی جس نے صاحبِ کردار کی روش

شیریں زباں سے آپ جہاں گیر ہو گئے ؛ اپنائی کم ہی آپ نے تلوار کی زباں

اعلیٰ سب سے بڑھ کر کردار آپ ہی ؛ ہیں سب نیک سیرتوں کا معمار آپ ہیں

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر علی شاعر نے اسی تبلیغی رویے کو اپنایا ہے کہ سیرتِ رسول کی پیروی ہی درحقیقت دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ حضورِ پاک کی محبت اور مقامِ مصطفوی کے بیان میں بھی شاعر علی شاعر کا قلم اپنی خوبصورتی برقرار رکھتا ہے ہوا ارتقا کی طرف مائل دکھائی دیتا ہے۔

حب حبیبِ پاک میں آنسو بہا کے دیکھ کر دیں گی تیرے قلب کی تطہیر رونقیں

دربارِ مصطفیٰ کا نہ کرتیں اگر طواف پاتیں کہاں سے دنیا میں توقیر رونقیں

گوشے ہیں جان و دل کے منور اسی سے بس زندہ ہے جس سے دل وہ محبت رسول ہیں

شاعری اپنے حسن بیان اور الفاظ کے چناؤ کے تحت ہی توقیر پاتی ہے۔ ہر چند کہ شاعر علی شاعر اس میدان میں ابھی نو آموز ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں شاعرانہ ذریعہء اظہار کچھ اس طرح سے ابھر کے سامنے آرہا ہے کہ ہمیں یہ توقع ہو رہی ہے کہ آنے والے دنوں میں ان کی شاعری اپنے معیار اور اسلوب کے لحاظ سے اور بھی زیادہ پختہ اور متنوع ہوگی۔

نعت میں شہر نبی سے وابستگی اور پھر ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے درودوں اور سلاموں کی فضاؤں میں سانس لینا ہر شاعر کی آرزو قرار پاتی ہے۔ شاعر علی شاعر بھی اسی کیفیت کی گود میں پلا بڑھا ہے۔

ہواؤں میں جنت کی سوئے ہیں آ کے درودوں کا جھولا جھلا چپکے چپکے

نصیبوں سے موقع جو ملتا ہے شاعر تو دل و جاں انھیں پہ لٹا چپکے چپکے

اس بات پر ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمنان حاصل ہوتا ہے اور یہی قرآن پاک میں فرمان بھی ہے۔ لیکن اگر اطمنان کی منزل تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ ہے تو وہ یقیناً مدحت رسول ہی کا راستہ ہے۔ جس سے گزر کر ہی انسان حمد و ثنائے رب کی حقیقی منزل سے آشنائی حاصل کر سکتا ہے اور شاعر علی شاعر اس بات سے بخوبی واقف ہے۔

زیر نظر کتاب شاعر علی شاعر کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے۔ نعت کے حوالے سے یہ نہ صرف نیکو کاری ہے بلکہ شاعرانہ لحاظ سے ان کے بہتر امکانات کی نوید بھی ہے۔

برائے فروخت

مصنف: محمد حامد سراج ☆☆☆ مبصر: شین۔ الف۔ شین

ناشر: محمد عابد علی، صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۱۴۰ روپے

محمد حامد سراج ان افسانہ نگاروں میں ہیں جن کا سماجی و ادبی شعور پختہ ہے اور جو فکر کو فن بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے مشاہدے کی آنکھیں تیز اور باریک بیں ہیں۔ وہ زیر مشاہدہ واقعات اور اشیا کو صرف

دیکھنے کے لئے نہیں دیکھتے بلکہ اس کی تہہ تک پہنچ کر اس کے نمود و ظہور کے اسباب و علل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کوئی بھی افسانہ سرسری اور سطحی تجربے کی مثالیہ نہیں ہے۔ وہ اپنے موضوع اور کرداروں سے فن کی زبان میں مکالمہ کرتے ہیں۔ ان کے مزاج، نفسیات، اور خواہشات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ کہانی کے کینوس میں ان کو ہیرے کی طرح کس طرح ٹانکنا ہے نیز اس کے لفظیات اور اسلوب کیا ہوں گے اس پر غور کرنے کے بعد تجربے کو تخلیقیت کا جوہر عطا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میرے پیش نظر ان کی تیسری تصنیف اور دوسرا افسانوی مجموعہ "برائے فروخت" ہے۔ ان کی پہلی کتاب "وقت کی فصیل" ہے اور دوسری کتاب "میا" ہے۔ پہلی کتاب افسانوں کا مجموعہ ہے اور دوسری کتاب دنیا کی اس محبت کرنے والی ہستی پر ہے جسے "ماں" کہا جاتا ہے۔ ماں تربیت کا گہوارہ بھی ہے بے لوث محبت کا سائبان بھی ہے۔ محمد حامد سراج نے اس کتاب میں انشاپردازی، افسانوی طرز نگارش اور مکالموں کا بھرپور جادو جگایا ہے۔ تقدس و پاکیزگی سے مملو جذبوں اور لفظوں سے ماں کی جو شخصیت پیش کی ہے وہ ایک فنکارانہ جست ہے۔ اسی طرح زیر نظر کتاب میں بھی ۱۹ کہانیوں کے توسط سے حقیقت کو افسانہ بنانے کا جوہر انتہائی عرق ریزی اور سچائی کے ساتھ دکھایا ہے۔

زیر نظر افسانوی مجموعے کی پہلی کہانی "گاؤں کا غیر ضروری آدمی" میں مصنف نے ہمارے سماجی کھوکھلے پن، بے حسی اور خود غرضانہ رویوں کی بڑی خوبی کے ساتھ عکاسی کی ہے۔ انداز بیان میں عمق کے باوجود متن بوجھل اور سپاٹ نہیں بلکہ رواں اور پرکشش ہے۔ مثلاً:

"زمین پر سورج کتنے قرنوں سے طلوع و غروب کے عمل سے گزر رہا ہے۔ یہ تخمینہ لگانا ممکن نہیں۔ سب اپنے اپنے محور پر گھوم رہے ہیں۔ چاند، ستارے، سورج، زمین، انسان، چرند پرند اور دکھ سکھ۔۔۔ سب گھوم رہے ہیں۔ اپنے اپنے حصے کی عمریں پوری کر رہے ہیں۔

وہ بھی ایک ایسی ہی صبح تھی۔ میں مسجد کے صحن میں بیٹھا کھلتی صبح کے اوراق گن رہا تھا۔

ایک شخص جس نے میلی سی پگڑی باندھ رکھی تھی، میرے پاس آ کر بیٹھا اور دھیرے سے بولا۔

'جی وہ خیر و لوہار مر گیا ہے۔ اس کے مرنے کا اسپیکر پر

اعلان کر دیں۔

'اس کے چہرے پر دکھ کا کوئی پرتو نہیں تھا۔

'کیا کہا۔۔۔؟

'خیر ولوہار مر گیا۔۔۔! کل تک تو وہ بھلا چنگا تھا۔'

کھلتی صبح کے اوراق بے ترتیب ہو گئے۔ مسجد کے گنبدوں سے نکلنے والا ایک سا اعلان۔۔۔ 'حضرات ایک ضروری اعلان سنیں۔ خیر محمد لوہار قضائے الٰہی سے فوت ہو گیا ہے۔ اس کی نمازِ جنازہ دن کے گیارہ بجے جنازہ گاہ میں ادا کی جائے گی۔"

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ یہ زیر بحث کتاب کا پہلا افسانہ ہے۔ اس افسانے کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ ایک تو حسن کارانہ بیانیہ اس پر تجسس کہ آخر خیر ولوہا کون تھا۔ اس کی موت کے ذکر سے کیوں افسانہ نقاب کشا ہوتا ہے۔ اس طرح افسانہ نگار قاری کے دل و دماغ میں خلش پیدا کر کے اس سے افسانے کی قراءت کراتا ہے۔ ہم اس کو دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں یہ افسانہ نویس کے قلم یا فن کا کمال ہے۔ اور اس قسم کے کمالات محمد حامد سراج اکثر دکھاتے رہتے ہیں۔

افسانہ کتنے ہی بے ساختہ پن کے ساتھ تخلیق کیوں نہ ہوا ہو۔ اس کی بنیاد فکر و شعور پر ہوتی ہے۔ یہ فکر و شعور ہی ہے جو فن کار کے اندرونی جذبوں سے ہم آہنگ ہو کر ایک ایسی بے ساختہ تخلیقی تمثال کی صورت اختیار کر جاتا ہے کہ قاری اس کے مطالعہ کے دوران پوری طرح اس فن پارے کی گرفت میں آجاتا ہے۔ یہ وصف بہت کم فنکاروں کے حصے میں آتا ہے۔ محمد حامد سراج ان ہی خوش نصیب تخلیق کاروں میں ہیں جن کے بیشتر افسانے ایک فطری بے ساختہ پن لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا افسانہ بھی بے حد دلچسپ، پرتاثیر اور رواں ہے۔ اس میں کردار نگاری کا وصف بھی اپنے بلند مطلعے پر دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور سے مہر دین، اس کی بیوی، ملازمہ ستو اور بے مرکز کا مرکزی کردار احمد دین کی شخصیت، سوچ اور حسیت کو بہت باریک بینی کے ساتھ لفظوں میں ڈھالا گیا ہے۔ اس کہانی کا بنیادی موضوع تو مکافاتِ عمل ہے مگر اس حوالے سے بعض ضمنی مسئلوں کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے جو سماجی زندگی میں کبھی کبھی غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس فن پارے میں افسانہ نگار نے اپنے موضوع سے انصاف کرنے کے ساتھ ساتھ فن سے بھی پوری طرح انصاف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ذرا ذیل

کے اقتباس کو پڑھیں۔ مہر دین اور احمد دین کے گفتگو:

مہر دین جوزانی، ان پڑھ، مغرور اور خودسر ہے احمد دین سے مخاطب ہوتا ہے۔

"آپ کا تعارف۔۔۔؟"

"مجھے احمد دین کہتے ہیں۔۔۔!"

"آپ چودھری ہیں 'ٹوانے' 'براج' 'سید' 'ملک'۔۔۔یا۔۔۔!"

وہ شخص مسکرایا۔۔۔ مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔

"میرے نام کے ساتھ کوئی سابقہ لاحقہ نہیں ہے۔"

"میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ اپنے نوکروں کو ساتھ لائے یا نہیں۔ سابق لاحقہ یقینی طور پر آپ کے ملازمین یا باڈی گارڈز کے نام ہوں گے۔"

وہ شخص پھر مسکرایا۔۔۔ عجیب شخص ہے صرف مسکرانے پر اکتفا کرتا ہے۔

"میں آپ کی تعلیم پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟"

"میں نے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد اپنی مزید تعلیم کے لئے جرمنی کی ایک یونیورسٹی کا انتخاب کیا ہے۔"

"تو گویا آپ ان پڑھ نہیں ہیں۔"

"نہیں۔۔۔"

"تو پھر یہاں اسمبلی میں کیا لینے آئے ہیں۔۔۔؟"

"ملک کی قسمت سنوارنے۔"

"یہ اسمبلیاں چلانا پڑھے لکھے لوگوں کا کام نہیں ہے۔ چونکہ اس ملک کی اکثریت ناخواندہ ہے اس لئے اسے صرف ہم ہی سمجھ اور چلا سکتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے جہالت کیا ہوتی ہے۔۔۔۔"

جی تو چاہتا ہے کہ ان کے سب ہی افسانوں سے اقتباس پیش کروں مگر مضمون بے جا طور پر طویل ہو جائے گا، جس کے متحمل اس کے پڑھنے والے نہیں ہوں گے۔ البتہ ایک اور افسانہ بھی حوالے کا متقاضی ہے۔ وہ ہے "افسانہ نگار نے بہت دیر کر دی"۔ اس کہانی میں مشرق کی تعیش پسندی اور مغرب کی تیز رفتار ترقی کا منظر نامہ بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دونوں خطوں کے حکمرانوں کی

سوچ، طرزِ زندگی اور مستقبل کے حوالے سے ان کے رویوں کو بڑی دردمندی اور ذہانت کے ساتھ کہانی کے رگ و پے میں اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً یہ جملے دیکھیں:

"یہ ان دنوں کا قصہ پارینہ ہے جب اہلِ مغرب بارود تیار کر رہے تھے اور مشرق کی دنیا، پرفیوم کی خوشبو میں مدہوش اپنے آپ سے بے گانہ تعیش کی پگڈنڈی پر سر پٹ بھاگی جا رہی تھی۔ اسے یہ ہوش ہی نہیں تھا کہ پلٹ کر دیکھتی کہ مغرب پسِ پردہ کیا کر رہا ہے۔"

"مغرب نے سارا سامان عربوں میں انڈیل دیا تھا۔ اور ہر چیز کے عوض وہ اپنی معیشت کی بنیاد میں ایسی کنکریٹ ڈال رہے تھے جو ان کی آنے والی نسلوں کو بھی سنوار دے۔ کویت کا ہر شہری الف لیلوی دنیا میں رہتا ہے۔ وہاں کے عام شہری نے بھی اپنے گھر کو محل میں بدل لیا ہے.........وہ تیل بیچتے اور آرام خریدتے تھے۔ زمین پر ہی انھوں نے جنت بسالی اور شداد کی جنت کا انجام بھول گئے .... مجھے سنجیدگی سے لوٹنے کا فیصلہ کرنا چاہئے......... افسانہ نگار وطن واپسی کے لئے پائی پائی جوڑتا رہا.........اور ہزاروں میل کی مسافت پر مغرب بارود جوڑتا رہا.........اہلِ مشرق سامانِ تعیش جوڑتے رہے.........

اس افسانے پر میں نے پہلے بھی یعنی ۲۰۰۴ء کے افسانوی جائزے میں اظہارِ خیال کیا تھا اور لکھا تھا کہ یہ افسانہ اتنے خوبصورت اور دلچسپ انداز سے شروع ہوتا ہے کہ قاری افسانے کی گرفت میں مکمل طور پر آجاتا ہے۔ ترشے ہوئے جملے، چبھتے ہوئے فقرے، مناسب اور متوازن ماجرائیت کی لڑیاں کہانی کو معنویت عطا کرتی ہوئی اس کی تکمیل کر رہی ہیں۔ مگر جس مضبوط بیانیہ اور اثر آفرینی کے ساتھ کہانی اپنے اختتام سے چند جملے پہلے تک پہنچتی ہے وہ کیفیت آخر تک قائم نہیں رہتی۔ اور اس پر بھی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ معلوم نہیں ایسی تخلیقی صلاحیت رکھنے کے باوجود محمد حامد سراج کہانی کے اختتام کو موثر بنانے کی طرف توجہ کیوں نہیں دے پاتے۔ بہر کیف وہ بلا شک و شبہ ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور ہر دوسرے تیسرے مہینے پر ایک قابلِ ذکر افسانہ اردو ادب کو دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

زیر بحث

شہر چراغاں (شعری مجموعہ)

مصنف: خورشید احمد ☆☆ مبصر: رؤف نیازی

ناشر: کانپور اکادمی، کراچی

یہ عالمگیریت (Globalisation) کا اعجاز ہے کہ عصر آگہی کا دائرہ تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی علوم کی حدود سے نکل کر بشریاتی، نامیاتی اور کونیاتی علوم کی سرحدوں کو چھونے لگا ہے آج ادب میں شعور وگہی کا نیا تناظر، نئی حسیات، نئی لفظیات اور نئے تلازمات کے ساتھ ایک نیا افق اور ایک نیا آسمان تخلیق کرتا دکھائی دیتا ہے زندگی فریب ذات کے دام سے باہر نکل آئی ہے۔ پھیلتی ہوئی کائنات میں انسان مسلسل سکڑتا جا رہا ہے تہذیب نفس ہمیں اس منزل پر لے آئی ہے جہاں خورشید احمد بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

ہم جب حصار ذات سے آگے نکل گئے
مفہوم کائنات کی سب رخ بدل گئے

اس کی حسیت میں معروضیت کے کرب کی یہ چبھن عالمی شعور انسانی کی بیداری کا اعلامیہ ہے حسن و صداقت کی تلاش میں ''شہر چراغاں'' کا خالق اپنے پورے تہذیبی رچاؤ اور جمالیاتی سجاؤ کے ساتھ بنگالی زبان کی مشہور نظم ''اتر بشنتو'' کے اردو ترجمے ''گذری ہوئی بہار'' میں یوں نظر آتا ہے۔

'جشن بہار میں شرکت کے لئے مجھے پورنما کی طرف سے دعوت دی گئی
میں نے اپنی بانسری لی اور بڑی خاموشی سے پورے ادب و احترام کے جذبے کے تحت اس دربار میں شریک ہوا
میرے دل کی رہ گذر پر خیالوں اور خوابوں کا سنہری ہرن چوکڑیاں بھرنے لگا
اور اڑتی ہوئی دھول میں جگنو سا چمکنے لگا
میں نے دربار میں اس کستوری کی لہراتی خوشبوؤں سے اپنے من پسند رسیلے گیت بنے ہیں

چاندنی میں نہاتے ہوئے استعاروں کی تازگی اور فرحت آفرینی، رومانویت اور جمالیت کی ایسی پر اسراریت کو تخلیق کرتی نظر آتی ہے جو کسی فن پارے کا بانکپن ہوا کرتی ہے اور قاری جس کے سحر میں

ڈوبتا چلا جاتا ہے

شعر و ادب کا ایک غیر ضروری کردار اپنی تہذیبی اور ثقافتی دریدگی اور برہنگی کو چھپانا بھی ہے ہماری کم وبیش پچاس سالہ زندگی میں کم از کم دو مواقع ایسے آئے جب ایک تہذیبی اور ثقافتی خلاء کو شدت سے محسوس کیا گیا مائیکل فوکو کے بقول تاریخ کا جبر اپنی بے بنیاد تحریکوں، جھوٹے نعروں اور طاقت کی ڈسکورسز (Discourses) کے باوجود اس شگاف کو پر نہ کر سکا شکست و ریخت کے اس عمل کے دوران اجتماعی شعور نے جن سماجی سچائیوں کو تاریخ کے دامن میں سمیٹ کر مستقبل کی مورخ کی رہ نمائی کا اہتمام کیا اس پر تخلیق کار نے کچھ اس طرح مار کیا ہے

زندگی سچ کی گواہی میں گزاری اس طور / زندگی میرے لئے جھوٹ رہی ہو جیسے

پرندے جب بھی کوچ کرنے لگتے ہیں / تمہارے طرز تغافل کی یاد آتی ہے

خورشید احمر کے احساس کی کسک اس کے شعور کی تمازت میں گھل کر رنگ و نور کے ایسے شعری پیکر تراشتی ہے جو اپنے قاری کو اعتماد اور سرشاری بخشتے نظر آتے ہیں "شہر چراغاں" ڈاکٹر حنیف فوق کے دیباچے، ڈاکٹر وفا راشدی کے تعارف اور پروفیسر اظہر قادری کے تبصرے سے مزین ہے اسے کانپور اکادمی کراچی نے شائع کیا ہے۔

دیر کبھی نہیں ہوتی

مصنف: طاہر نقوی ☆☆ مبصر: ش۔ا۔ش

ناشر: ادارہ ممتاز مطبوعات، کراچی۔

ادب کی تمام اصناف اپنے اپنے صنفی تقاضوں کے مطابق زندگی اور کائنات میں بکھرے ہوئے واقعاتی نقوش اور احساساتی آثار کے ساتھ ساتھ انسانوں کی باطنی دنیا میں لہو پیرہن تمناؤں اور ولولوں کی قتل گاہوں میں خون ہوتے ہوئے آدرشوں کو کیپسول کرنے اور فنی رنگ آمیزی سے مجتمع کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس کام کو پہلے داستانوں نے بڑی وسعت کے ساتھ انجام دیا اور اپنے عہد کو اس کے اپنے رنگ ڈھنگ میں بڑی کامرانی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس وسیع اور پھیلی ہوئی صنف کے بطن سے ایک اور صنف نے جنم لیا اور ناول کہلایا۔ داستانوں کے پیکروں کو تراشنے اور ناول کے خال وخد کو اجاگر کرنے کا عمل جاری رہا۔ وقت کی تیز رفتاری اور بڑھتی ہوئی مصروفیت نے ناولٹ اور طویل کہانی کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کہانی اور افسانہ اپنے تیکھے نقوش کے ساتھ سامنے آئے۔ مصروفیت جتنی بڑھتی گئی اور زندگی کی رفتار جتنی تیز ہوتی گئی افسانے اور کہانیاں لکھنے والوں کی ذمہ

داریاں بھی بڑھتی گئیں۔

بیانیہ، استعاراتی، تجریدی، علامتی اور پلاٹ کے بغیر ایک احساس، خیال کی لہر، تصور کی چھب اور معمولی تجربے کی اساس پر کہانیاں اور افسانے تخلیق کیے جانے لگے۔ آج ہمارا افسانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اس میں کامیاب اور ناکام دونوں تجربے کے گل و خار آگے ہیں۔ اگر ایک کہانی پڑھ کر بدمزگی کے خار احساس کو زخمی کرتے ہیں تو چار کہانیاں ہمارے فکر و احساس کو لطافت اور بالیدگی سے بھی ہمکنار کرتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے علاوہ یورپ، امریکہ، افریقہ، مشرقِ وسطیٰ بلکہ دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک میں اردو افسانے اور کہانیاں لکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ جن کے ناموں کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ اس کے باوصف اس فہرست میں کچھ نام شامل ہونے سے رہ جائیں گے۔

لکھنے والوں کے ہجومِ بے پناہ میں پناہ حاصل کرنا، نشانِ امتیاز پیدا کرنا، اسلوب کی رنگارنگی میں اپنا الگ رنگ رکھنا اور قافلے میں شامل ہو کر قافلے سے الگ دکھائی دینا آسان کام نہیں۔ لیکن اس مشکل کام کو بہت سارے کہانی کاروں کی طرح طاہر نقوی نے بھی کسی حد تک آسان کر دکھایا ہے۔ اس بات کے گواہ ان کے وہ افسانے ہیں جو زیرِ نظر مجموعے "کبھی دیر نہیں ہوتی" سمیت چار افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔

طاہر نقوی نے کافی افسانے تخلیق کیے ہیں اور مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ پاک و ہند کے سارے رسالوں میں ان کی کہانیاں چھپتی رہی ہیں۔ زیرِ بحث افسانوی مجموعے "کبھی دیر نہیں ہوتی" سے پہلے ان کے تین، افسانوی مجموعے "بندلیوں کی چیخ"، "حبس کے بعد پہلی بارش" اور "شام کا پرندہ" منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

جب ان کی افسانہ نگاری کی بندلیوں سے چیخ نکلی تو اس تخلیقی کربنا کی کے صلے میں ۱۹۸۲ء میں ان کو آدم جی ادبی انعام سے نوازا گیا۔ اس طرح گھٹن میں کمی آئی اور تخلیقی بارش نے حبس کا خاتمہ کر دیا۔ پھر کھلی اور تازہ فضا میں شام کے پرندوں نے آشیانوں کا رخ کیا۔ اس لئے جب کرب راحت میں بدل جائے، حبس بے نمود ہو جائے اور بھٹکے ہوئے طائر گھونسلوں کو لوٹ جائیں تو حوصلہ مند لوگ یہی کہتے ہیں کہ "کبھی دیر نہیں ہوتی" اگرچہ دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

ان کے تازہ مجموعے کی پہلی کہانی "دیر کبھی نہیں ہوتی" کے عنوان پر ہی کتاب کا نام بھی رکھا گیا ہے۔ یہ کہانی میاں بیوی کے باہمی روابط کی زمین میں نمو پاتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اس کہانی کی سطور اور بین السطور میں نفسیاتی کیفیات کو رچانے اور بسانے کی کوشش ملتی الجھن، طیش، وہم اور

شکوک کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ بے جا اور بے نام جذبوں کی شدت بھی کرداروں کے وسیلے سے پیش کی گئی ہے۔ اس کہانی میں بیوی کا کردار اور شخصیت جتنی عمیق اور گمبھیر ہے شوہر کا کردار اس کے اتنے ہی برعکس ہے۔ وہ بہت سامنے کی سوچ رکھنے والا، بے بات کی بات بنانے والا، سطحی اور جذباتی قسم کا آدمی ہے۔ مگر اس کی بیوی کی شخصیت میں تہہ داری ہے۔ وہ مخلص، دور اندیش اور صبر و تحمل کی مثالیہ ہے۔ شوہر دریا کی طرح پر شور ہے اور بیوی عمیق بحر کی طرح پر سکوت۔ دراصل بیوی کا کردار ہی اس کہانی کی جان اور شان ہے۔ ایک سادہ عورت کے خاکے کو جس طرح مختلف قدروں کے رنگ سے ارتقا پذیری عطا کی گئی ہے وہ قابل توجہ اور لائق ستائش ہے۔ نفسیاتی حسیت، اندرونی کیفیت اور خاموش گویائی کو کرداروں کے جسم و جاں اور فکر و احساس کا حصہ بنانا اور پھر ایک خاص تشکیلی عمل کے ساتھ ماجرائیت اور منطقیت کو تخلیقیت کا پیکر عطا کرنا ایک مشکل کام ہے۔ طاہر نقوی کی یہ فنکارانہ کوشش بلاشک وشبہ مشکور ہوئی ہے۔ البتہ اختتام کچھ کمزور پڑ گیا ہے۔ "ستارہ" اگرچہ بہت چونکانے والی کہانی نہیں ہے تاہم یہ ہمارے معاشرے کی مختلف تہوں اور پرتوں کو کھولتی ہے۔ بہت سے ان گھناؤنے مناظر کو فن کارانہ انداز میں پیش کرتی ہے جن کے بارے میں تھوڑا بہت سب ہی جانتے ہیں۔ ایک تخلیق کار کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ جانے ہوئے وقوعات کو اس اسلوب اور ڈھنگ میں پیش کرے کہ زیب داستان کے وصف کے ساتھ ساتھ اس میں تحیر کا ذائقہ بھی ہو اور صداقت کی روشنی بھی۔ کہانی کے انجام اگرچہ اختتام سے کچھ پہلے ہی ہو جاتا ہے مگر اس کے باوجود یہ ایک اچھی کہانی کہی جا سکتی ہے۔

افسانہ "مہمان" اس تلخ حقیقت کا عکاس ہے جو طربیہ کی زیریں لہروں میں المیہ رکھتی ہے۔ روشن مستقبل، دولت کمانے اور آسائش کے حصول کے لئے ملک سے باہر جانے کا جو رجحان اپنے شباب پر ہے۔ اس شباب نے بہتوں کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ والدین اپنی اولاد کے حوالے جو خواب دیکھتے ہیں وہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ ماں باپ کن کن مشکلات کا سامنا کر کے ان کو تعلیم دلاتے ہیں، ان کی ترقی کے لئے قرض لے کر ان کے بیرونِ ملک جانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اور جب یہ اولاد باہر جا کر دولت کماتی ہے تو عیش و عشرت میں کھو کر ماں باپ کو فراموش کر دیتی ہے۔ جن کی بدولت ان کا وجود قائم ہے انہی کی یادوں کو اپنے دل و دماغ سے کھرچ دیتی ہے۔ ایک باپ کبھی اپنے بیٹوں کے خطوط کی راہ دیکھتا ہے، کبھی ان کی آمد کا انتظار کرتا ہے اور تنہائی کا زہر پیتا رہتا ہے یہ زہر بالآخر اس کی جان لے لیتا ہے۔ بیٹوں کا مہمان بن کر آنے کا خواب ادھورا رہ جاتا اور بیٹوں کے بجائے بوڑھے کے گھر موت مہمان بن کر آ جاتی ہے۔

طاہر نقوی کو انسانی مسئلوں کا گہرا ادراک ہے۔ وہ اپنے معاشرے کی بیدار مغزی کے ساتھ

زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر جز کا مطالعہ وہ اتنی گہرائی کے ساتھ کرتے ہیں کہ جیسے وہ جز نہ ہو کل ہو۔ وہ بے شک قطرے میں دجلہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مخزن۔۔۴ (جریدہ)

مرتب: مقصود الٰہی شیخ ☆☆ مبصر: ش۔ا۔ش

ناشر: بزمِ تخلیق ادب پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶۶۷

مقصود الٰہی شیخ کی ذات کئی جہتوں کا مجموعہ ہے۔ وہ نہ صرف ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں بلکہ ایک لائق، محنتی اور مشاق مدیر بھی ہیں۔ وہ معیاری اور دلچسپ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ ''راوی'' کے حوالے سے ان کی قابل قدر ادبی اور صحافتی کارگی کے نقش وعکس اردو ادب کی ادبی صحافت کی تاریخ کے اوراق میں بہت نمایاں اور روشن ہیں۔ برطانیہ کے شہر بریڈ فورڈ کے ''راوی'' اور مقصود الٰہی شیخ کو لازم وملزوم اسی لئے تصور کا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا ہفت روزہ تھا جس کے ہر شمارے سے مقصود الٰہی شیخ کے فکری زاویے، تجزیاتی سوجھ بوجھ، جذبۂ خدمتِ اردو اور علم وفن کا شعور مترشح تھا۔ یہی حال زیر بحث جریدہ نما کتاب ''مخزن'' کا ہے۔ اس میں بھی قدم قدم پر مرتب کی کاوشوں، بے لوث جذبوں اور دوسروں کو آگے بڑھانے کی خواہشوں کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ مخزن نمبر چار کو مقصود الٰہی شیخ نے مخزن نمبر ایک، دو اور تین سے قدرے مختلف رکھا ہے۔ یہ قدم بھی جدت کی جانب ایک پیش رفت سے عبارت ہے۔ پہلے شمارے سے لے کر چوتھے شمارے تک انھوں نے ہر بار نئے پن کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنی اس کوشش میں کامراں ٹھہرے ہیں۔

''مخزن۔۴ کو مرتب نے دس حصوں میں منقسم کیا ہے۔ ہر حصہ پر کشش اور دلچسپ ہے۔ پہلے حصے کو ابتدا کا عنوان دیا گیا ہے اس کے تحت ایک اور ذیلی عنوان ''اولیہ'' ہے اس کے بعد اداریہ کا عنوان ''چل پڑا ہے قافلہ'' ہے اس کے بعد ڈاکٹر انور سدید کا ایک مضمون ہے جس میں انھوں نے شیخ عبدالقادر کے اصل ''مخزن'' ۱۹۰۱ کے پہلے دور، اس کے دوسرے دور جو حفیظ جالندھری کی ادارت میں نکلا، اس کے تیسرے دور جس کا اجرا حمید نظامی نے کیا تھا اور چوتھے دور جس کا آغاز عنایت اللہ کی نگرانی اور ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں ہوا تھا اس کے پس منظر اور تاریخی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ پھر مقصود الٰہی شیخ کے''

مخزن" کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کے اظہاریے کا عنوان "رسالہ "مخزن کا نشاۃ ثانیہ" ہے۔جس کے اختتامی جملے یہ ہیں:

"مقصود الٰہی شیخ کا یہ تجربہ کامیاب نظر آتا ہے۔البتہ معیار میں تھوڑی سی رعایت دینی پڑے گی۔اسے بارش کا پہلا قطرہ قرار دیا جائے تو امکان ہے کہ مزید رشحات بھی کتابی صورت میں رونما ہوں گے اور اس کا کریڈٹ مقصود الٰہی شیخ کو ملے گا۔"

جہاں تک معیار کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے متنازعہ رہا ہے اور رہے گا۔اگر کسی فن پارے، کسی کتاب یا کسی جریدے کی مجموعی حیثیت کو پرکھا جائے اور اس کے بعد یہ نتیجہ سامنے آئے کہ اس کے معتدبہ حصے کے میزان کا جھکاؤ خوبیوں کی جانب ہے تو متعلقہ زیرِ بحث فن پارہ یا رسالہ لائقِ تحسین قرار پائے گا۔انور سدید کی رائے حوصلہ افزا اور مثبت ہے۔اسی حصے میں "ابرِ کرم" کے عنوان سے رسالہ "مخزن" کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی، افتخار عارف، شمس الرحمٰن فاروقی، رالف رسل اور دیگر سات افراد کے پیغامات ہیں۔جن میں مقصود الٰہی شیخ کی اردو دوستی، ادب نوازی، اخلاص مندی اور مسلسل جدوجہد کو نشان زد کرتے ہوئے مرتب کی صلاحیت کا حقیقت پسندانہ انداز میں اعتراف کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ چھ مضامین پر مشتمل ہے۔یہ مضامین "ادب/تدریس/تجربات/صحافت" کے عنوان کے تحت شامل کیے گئے ہیں۔اس حصے میں آصف جیلانی کا مضمون "برطانیہ میں اردو صحافت"، ڈاکٹر صفات علوی کا مقالہ "اردو کی تدریس اور جدید انفارمیشن ٹکنالوجی"، ڈاکٹر عطش درانی کا مقالہ "ادب و لسانیات میں تجرباتی تخلیق کا تجزیہ" اور مقصود الٰہی کی تحریر "رالف رسل کے خیالات پر ایک نظر" اپنی جامعیت اور موضوعاتی اہمیت کے اعتبار سے قابلِ قدر تحریریں ہیں۔

تیسرے حصے کو یادوں یا خودنوشتوں کے لئے مختص کیا گیا ہے۔اس حصے کے ماتھے پر "اپنی اپنی کہانی" کا جھومر آویزاں کیا گیا ہے۔اس حصے میں معروف افسانہ نگار منشا یاد اور یامقبول جان نے عہدِ رفتہ کی بازیافتگی کی کوشش کی ہے۔یہ حصہ بھی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

چوتھا حصہ مختصر ہونے کے باوصف دوسرے حصے کی طرح وقیع ہے۔اس کے مکھڑے پر "اردو لسانیات/صوتیات کی بندیا چمک رہی ہے۔اس حصے میں دو مضامین ہیں۔پہلا مضمون ڈاکٹر الٰہی

بخش اعوان کا ہے اور دوسرا مضمون ڈاکٹر عطش درانی کا ہے جو اعوان صاحب کے مضمون کا تجزیہ ہے۔
ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان نے صوتیات۔۔ لفظی ساختمان" کے عنوان سے بڑی عرق ریزی اور دقت نظری کے ساتھ الفاظ کی ساختوں کو صوت اور ان کی ادائیگی کے حوالے سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے خیالات سے اختلاف کی گنجائش تو ہے جیسا کہ بعض مقامات پر اس مضمون کے تجزیہ نگار ڈاکٹر عطش نے اختر اعوان سے کیا ہے مگر موضوع، تحقیقی امنگ، باریک بینی اور ان کی علمی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ڈاکٹر عطش نے بھی اپنے تجزیے میں کافی عمیق اور وسیع تناظر سے کام لیا ہے اور لسانیات کے میدان میں صوت ولفظ کی معنی خیز بحث کے نئے دریچے کھولنے کی کوشش کی ہے۔دونوں تحریریں اپنے دامن میں نئی معلومات کے جوہر رکھتی ہیں۔

پانچواں باب محمود ہاشمی کے گوشے سے کھلتا ہے۔یہ گوشہ محمود ہاشمی کی تحریروں، ان کے نام لکھے ہوئے مشاہیر کے کچھ مکتوبات، ہاشمی صاحب کی شخصیت اور فن پر پروفیسر جعفر بلوچ اور ڈاکٹر انور سدید کے مضامین پر مشتمل ہیں۔

چھٹا باب ناٹک کے نام سے کھلتا ہے۔اس میں جاوید دانش کے مختصر تعارف کے ساتھ ان کا ڈرامہ "عہد کا کرب" شامل ہے۔اس ڈرامے کو فن کے ترازو پر حقانی القاسمی نے تولا ہے اور پروفیسر آفاق صدیقی نے نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔

ساتواں باب نگارستان ہے۔یہ محفل، کہانی اور افسانہ لکھنے والوں سے سجی ہوئی ہے۔اس میں کل ۱۶ افسانہ نگاروں کی کہانیاں ہیں اور ہر افسانہ نگار کے افسانوں پر دو دو ناقدین کے نقد پارے ہیں کسی نے ان کو فکر وفن کے حوالے سے تولنے کی کوشش کی ہے اور کسی نے تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔

جز ہشتم کی پیشانی پر "نگار سخن" کے الفاظ سجے ہوئے ہیں۔جز ہفتم کی طرح یہ بھی فن پاروں اور ان کے تجزیوں پر محیط ہے۔اس مجلس میں صرف شعرا اور ان کے شعری فن پاروں کے تجزیہ نگار ہیں۔
اس شعبے میں ۲۴ شاعروں کی غزلیں، نظمیں اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔ان شعراء کی شاعری پر تقریباً پچاس نقد نگاروں کے مطالعاتی تجزیے پیش کیے گئے ہیں۔

حصہ نہم دو سفر ناموں اور ان کے تجزیوں پر مشتمل ہے۔چمن لال چمن نے پاکستان کا سفر نامہ قلم بند کیا ہے اور شوکت برجیس نے سفرِ ہندوستان کا حال لکھا ہے۔دونوں سفر نامے تازگی اور تجربات سے مملو

ہیں۔

دسواں باب بھی یادنگاری سے متعلق ہے۔اس میں محمد ایوب کی دو یادیں اور محمد نصر اقبال ڈار کی ایک یادشامل ہیں۔ان پر چار قلم کاروں نے اپنا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

'مخزن' میں شامل تمام تخلیقات چاہے وہ تجزیہ شدہ ہوں یا بغیر تجزیہ کے مرتب کی ادبی پرکھ، حسن انتخاب اور ذوق وشوق کی آئینہ داری کرتی ہیں۔یہ کام بڑا وقت طلب اور جان جوکھوں میں ڈالنے والا ہے۔مجھے اس کا علم ہے کہ مرتب کو کتنے تقاضے اور کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں تب کہیں جا کر ان کو لوگوں سے ان کی تخلیقات اور فن پارے حاصل ہوئے ہیں۔پھر ان فن پاروں کو مدیرانہ ذمہ داری کے ساتھ پڑھنا ان کا انتخاب کرنا، کمپوز کرانا۔ان کاموں کی اہمیت اور دقت کو وہی لوگ بخوبی محسوس کر سکتے ہیں اور صحیح داد دے سکتے ہیں جو ان مراحل سے گزر چکے ہیں یا گزر رہے ہیں۔

اختلاف کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔زیرِ نظر مخزن کے شمارے پر بھی لوگ نکتہ چینی کریں گے جو مخلص ہیں وہ بھی اور جو غیر مخلص ہیں وہ بھی۔مگر مجموعی طور پر لوگوں کی اکثریت مقصود الٰہی شیخ کی کوشش کی داد ضرور دے گی۔ان کے دل میں اردو کی محبت سمندر کی طرح ٹھاٹیں مار رہا ہے۔وہ اردو کی الجھی زلفوں کو سنوارنے، اس کے رخساروں کو خونِ جگر کی سرخی دینے اور اس کی بامعنی بقا و ارتقا کے لئے رات دن مصروف رہتے ہیں۔وہ ہم پاکستانیوں سے زیادہ خلوص، تپاک اور وسیع القلبی کے ساتھ زبان وادب کی خدمت کر رہے ہیں۔کسی ادبی جریدے کا مرتب کرنا ایک کل وقتی کام ہے اس کام کے بعد کسی اور کام کی گنجائش بڑی مشکل سے نکلتی ہے۔مگر مقصود الٰہی شیخ اس کل وقتی کام کے ساتھ ساتھ اپنے تخلیقی کام کو بھی اسی لگن، للک اور محنت سے انجام دے رہے ہیں۔

میں آخر میں یہ ضرور کہوں گا کہ "مخزن" واقعی مخزن ہے۔اس کے دامن میں علم وعرفان، نقد ونظر، جمال وکمال اور دیگر بہت سارے سرمایہءگراں بہا موجود ہیں۔

مظہر امام: نئی نسل کے پیشرو

مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی / مبصر: زاہد رشید

ناشر: نرالی دنیا پبلی کیشنز ۳۵۸۔اے، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

قیمت: ایک سو پچاس روپے ☆☆☆ صفحات: ۱۱۲

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ایک سیماب صفت ادبی و علمی شخصیت ہیں۔ وہ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ادب وفن کا کون سا میدان ہے جہاں انھوں نے اپنے نقوش نہیں چھوڑے۔ ہردم رواں اور ہردم جواں رہتے ہیں اور مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔۔

ان کی زیر نظر تصنیف "مظہر امام: نئی نسل کے پیشرو" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مظہر امام کی شخصیت اور فن سے متعلق ہے۔ مظہر امام نے اردو اور فارسی میں ایم۔اے کیا۔ "زخم تمنا"، "رشتہ گونگے سفر کا" "پچھلے موسم کا پھول" اور "بند ہوتا ہوا بازار" ان کے شعری مجموعے ہیں۔ نثر میں چار کتابیں "آتی جاتی لہریں"، "ایک لہر آتی ہوئی"، "آزاد غزل کا منظر نامہ"، "جمیل مظہری" اور "اکثر یاد آتے ہیں" شائع ہو چکی ہیں۔

مظہر امام کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جن اہل قلم کی آرا شامل ہیں ان میں نیاز فتح پوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین، فراق گورکھپوری، آل احمد سرور، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور جمیل مظہری جیسی بلند قامت ادبی شخصیات شامل ہیں۔

اس کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ نظم ونثر کے سرقہ کے حوالے سے ہے۔ مظہر اما کی ادبی شخصیت کا یہ بھی ایک معتبر گوشہ ہے۔ مظہر امام نے آزاد غزل کی بنیاد ڈالنے سے اس کی ترقی کی منزلیں طے کرنے تک کے حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے۔ اور آزاد غزل کی بنیاد ڈالنے کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر مناظر نے جس عقیدت، محبت اور دلچسپی سے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ انھوں نے مظہر امام کی شخصیت اور نظم ونثر کے حوالے سے جو کچھ بھی پیش کیا ہے اس سے نہ صرف مظہر امام کی ادبی کارناموں کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ بحث وتمحیص کے کئی در بھی کھلتے ہیں۔ کئی نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ مظہر امام جیسے شاعروں اور ادیبوں کے لئے جو زندگی کے روز وشب ادب کی نذر

کر دیتے ہیں ان کو سوائے ناقدری کے کیا ملتا ہے۔۔ ایسے میں ان کی صلاحیتوں، کارناموں اور خدمات کا اعتراف ہی کر لینا بڑی بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعتراف صرف مظہر امام کی شخصیت ہی نہیں بلکہ تمام اردو ادبا و شعرا کے لئے تازہ خون فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

اس کتاب کو مسلسل لکھا گیا ہے۔ صفحہ ۱۴ سے سلسلہء آغاز ہوتا ہے اور صفحہ ۱۱۱ پر اختتام پذیر۔ نہ ابواب ہیں، نہ سرخی، نہ ضمنی سرخی۔ اگر اس میں ترتیب اور حسن ترتیب کا اہتمام کیا جاتا اور اسے مندرجہ ذیل ابواب میں تقسیم کیا جاتا تو اس کی اہمیت و افادیت میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا:

۱) مظہر امام سے گفتگو (جو ۲۶ صفحات پر محیط ہے)۔

۲) مظہر امام کی شاعری پر ایک نظر۔

۳) مظہر امام کی شاعری، تاثر پذیری اور سرقہ۔

۴) مظہر امام اہل علم وادب کی نظر میں۔

۵) مظہر اما کی نثر کا سرقہ۔

۶) مظہر امام اور عصبیت شکنی

۷) مظہر امام پر تنقید اور ان کی تحمل پسندی۔

گوشۂ مجنوں گورکھپوری

مجنوں گورکھ پوری مختصر حالاتِ زندگی

خاندانی نام:۔	احمد صدیق
تخلص:۔	مجنوں
والد کا نام:۔	مولوی محمد فاروق دیوانہ
دستاویزی سن پیدائش:۔	10 جنوری 1904
اصلی تاریخ پیدائش:۔	10 مئی 1904
ابتدائی تعلیم:۔	سینٹ اینڈریوز اسکول گورکھ پور
میٹرک:۔	1921 گورکھ پور
ایف۔اے:۔	1927 مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
بی۔اے:۔	1929 سینٹ اینڈریوز کالج گورکھ پور
ایم۔اے (انگریزی):۔	1934 آگرہ یونیورسٹی
ایم۔اے:۔	1935 کلکتہ یونیورسٹی

درس و تدریس

1932 تا 1935 لکچرر شعبۂ انگریزی سینٹ اینڈریوز کالج گورکھ پور

جولائی تا دسمبر 1935 لکچرر شعبۂ انگریزی سربراہ شعبہ تعلقات عامہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

جولائی 1936 تا مئی 1937 لکچرر (انگریزی و منطق) میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج گورکھپور

جولائی 1937 تا ستمبر 1958 پروفیسر انگریزی، صدر شعبۂ اردو سینٹ اینڈریوز کالج گورکھ پور

ستمبر 1958 تا اکتوبر 1958 صدر شعبۂ اردو گورکھ پور یونیورسٹی

نومبر 1958 تا مئی 1968 اسسٹنٹ ڈائریکٹر علیگڑھ تاریخ ادب اردو اور ریڈر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

پروفیسر مجنوں گورکھپوری مئی 1968 میں پاکستان تشریف لائے اور 1978 تک کراچی یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

شادی: 14 اکتوبر 1926

اولاد: تین بیٹے۔ ظفر عالم، قمر عالم، بدر عالم راحل

بیٹی:۔ تہمینہ — داماد: اقبال احمد۔ پلانٹ انجینئر اٹامک انرجی کمیشن کراچی

مجھے نسبت کہاں سے ہے

مجنوں گورکھپوری

بشنواز نے چوں حکایت می کند

از جدائیہا شکایت می کند

آج ایک لطیف اور نازک کسک کے ساتھ کئی روز سے مجھے رومی کا یہ شعر یاد آرہا ہے' کسی زمانے میں مجھے اس مثنوی کو جس کو پہلوی زبان کا قرآن کہا گیا ہے' بیشتر حصے پورے کے پورے یاد تھے' اس وقت بھی جی چاہتا ہے کہ آگے کے اشعار پڑھتا جاؤں' لیکن فی الحال میرا مطلب اسی شعر سے ادا ہو رہا ہے' اس تحریر کے پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ زبردستی کی کھینچ تان کیسی؟ رومی کی مثنوی جس کو میں 'بانسری کا الم نامہ' "The Tragedy Of Thereed" کہا کرتا ہوں تمثیلی کلام ہے جس کا موضوع حقیقت اور عرفانِ حقیقت ہے' روحانیت کے رموز و نکات کو مادّی دنیا کے عارضی اور کثیف معاملات و مسائل سے تعبیر کرنا اور عالمِ بقا کے حقائق و معارف کو اس دارِ فنا کے حالات و حوادث پر منطبق کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ اعتراض ایک خاص مقام اور ایک خاص زاویہ نگاہ سے درست اور بجا ہوگا لیکن ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ ہے' شاعری کی رمزیت کو بہت جامع اور ہمہ گیر ہونا چاہیئے اور عظیم المرتبت اور جلیل القدر شاعری میں ایسا ہی ہوتا ہے' بلاغت دراصل اسی کا نام ہے۔

عام طور سے حقیقت کے اسرار مجاز کے پردے میں تلاش کئے جاتے ہیں۔ مادّی اور جسمانی زندگی کے استعارات میں روحانی تجربات و واردات بیان کرنے کا دستور بہت عام ہے' خسرؔ و جامی و سعدی اور حافظ وغیرہ کے سادہ اور معمولی سے معمولی اشعار کی جب تک عارفانہ تاویل کر کے ان میں تصوّف کا مفہوم نہ پیدا کیا جائے ہماری تسکین نہیں ہوتی' چاہے خود شاعر نے شعر کہتے وقت شعوری طور پر اس کا کوئی لحاظ نہ رکھا ہو۔ میرا میلانِ طبع اور میری عادتِ فکر اس کے برعکس رہی ہے۔ عالمِ صور کی رنگینیوں میں ایک جلوۂ بے رنگ دیکھنا ایک بہت پرانی رسم ہے' میں ہمیشہ عالمِ حقیقت کی بے رنگی ایک رنگی میں عالمِ مجاز کی

جملہ رنگینیاں تلاش کرتا رہا' بڑے سے بڑے عارفانہ بصیرت رکھنے والے شاعر کے نازک سے نازک شعر میں مجھے اس وقت لذت نہیں ملی جب تک کہ وہ ہمارے مادی وجود کے علمۃ الورود تجربات پر بھی محیط نہ ہو' اور ان پر بھی صادق نہ آتا ہو۔ شعر کی زبان سادہ سے سادہ ہوتے ہوئے بھی استعاری ہوتی ہے' یعنی اس میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سطح تک ایک ہی انداز کے متعدد تجربات و مواقع پر صادق آسکے اور میں اپنے مطالعے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کی تمام شائستہ زبانوں میں بہترین اشعار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شعر کی اصل عظمت یہی ہے۔ مثال کے طور پر رومی کا یہی شعر لیجئے جس کو میں لاکھ چاہوں اس وقت اپنے ذہن سے نکال نہیں سکتا' حالانکہ اس وقت مجھے یہ سوچنا اور بتانا ہے کہ میرا اصلی وطن کہاں ہے۔

گزشتہ تیس سال کے اندر مجھ سے نہ جانے کتنی بار پوچھا جا چکا ہے کہ میں اپنے قلمی نام کے آگے گورکھ پوری کیوں لکھتا ہوں۔ پوچھنے والوں کی تعداد بستی کے لوگوں کی ہے۔ میں نے اس لئے اس کا جواب دینے سے ہمیشہ گریز کیا جن دنوں میں رسالہ 'ایوان' نکالتا تھا اور فرصت اور ذہنی فراغت کی فراوانی تھی' اور میں تفصیل کے ساتھ لکھ سکتا تھا' اس سوال کو ٹالتا ہی رہا لیکن ابھی دو چار روز ہوئے میرے دیرینہ دوست جناب تارا شنکر ناشاد نے جو یکسیر یا انٹر کالج بستی میں معلم ہیں سے کچھ اس طرح دریافت کیا ہے کہ آج میں اس سوال کا جواب دے کر سبک دوش ہونا چاہتا ہوں جس سے آج تک گریز کرتا رہا لیکن قبل اس کے کہ میں اصل سوال کی طرف رجوع کروں ایک اور بات قابل ذکر ہے جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ذرا زمانہ میں الٹے پاؤں چلئے اور اب سے کم وبیش چالیس سال پہلے کے ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن واقعہ کی روداد سنئے۔ ابھی 'جوانی کی راتیں' اور 'مرادوں کے دن' بھی اچھی طرح نہیں آئے تھے' یعنی پندرہ یا سولہ برس کا بھی سن نہ تھا' لیکن شعر و سخن کا حوصلہ نشہ کی طرح عروج پر تھا' اور ساری ہستی پر چھایا ہوا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کے فارسی اردو کے اشعار اس طرح یاد تھے کہ انہیں کی سانسیں لیتا تھا ۔خود بھی شعر کہنے کی دھن میں رات دن کھویا رہتا تھا۔ فارسی یا اردو کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر ایسا ہو جس کی مشہور سے مشہور اور مشکل سے مشکل غزل پر میں نے دو چار شعر نہ کہے ہوں۔ اکثر اساتذہ کے مصرعوں پر میں خود اپنے مصرے لگا لیتا تھا خود اپنے مطالب ادا کرنے کے لئے تخلیقی اپج کی گرمی ہر لمحے مجھے بے چین رکھتی تھی' اور میں اس بے چینی میں عجیب لذت محسوس کرتا تھا۔ غرض کہ عجب سرشاری اور مدہوشی کا زمانہ تھا۔

شعر کہنے کے لئے ایک عام اور دیرینہ رسم تخلص رکھنا بھی ہے۔ میں اپنے کو اس رسم کی پابندی سے آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر سوچا اور دوسروں نے بھی سمجھایا کہ جب سر سیدؔ جیسے نثری مزاج رکھنے والے نے اپنے لئے 'آہی' کا تخلص ضروری سمجھا اور جب سید جالب دہلوی جیسے غیر شاعر نے اپنے لئے ایسا غیر شاعرانہ تخلص اس طرح رکھ لیا کہ آج ان کا اصلی نام کسی کو یاد بھی نہیں اور جب شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد جن کا ایک شعر بھی حافظہ میں رہ جانے کی قابلیت نہیں رکھتا بغیر تخلص کے نباہ نہ کر سکے تو پھر میں کس شمار وقطار میں؟ میرے لئے بھی کوئی نہ کوئی تخلص ضروری ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ تخلص کیا ہو؟ میرا مطالعہ اس وقت بھی بڑا وسیع تھا اور جو تخلص ذہن میں آتا تھا اور جو تخلص ذہن میں آتا تھا اس تخلص سے کم سے کم نصف درجن شاعر گزر چکے تھے آخر کا ایک دن میں نے جھنجلا کر کہا میں ایسا تخلص رکھوں گا جو مجھ سے پہلے کسی نے نہ رکھا ہو اور جس کو آئندہ بھی رکھتے ہوئے ہر شخص ہچکچائے یعنی 'مجنوں'۔ یہ غالباً ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے جب کہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں نے تو جھنجلاہٹ میں یہ کہا تھا اور شاید یہ بات درگزشت ہو جاتی اور میں کوئی تخلص نہ رکھتا لیکن میرے ایک بچپن کے عزیز اور دوست تھے جو میرے ساتھ ہی رہتے تھے اور جو ابھی حال ہی میں کلکٹری سے پنشن لے کر گھر بیٹھے ہیں۔ ان کا نام احمد حسین ہے اور وہ مشہور انشاء پرداز مہدی حسن افادی الاقتصادی کے بیٹے ہیں۔ وہ یہ تخلص لے اڑے اور مجھے اس شہر میں احباب کے حلقے میں اس نام سے پکارنا شروع کیا۔ آخر کار میں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ قلمی نام اختیار کر لیا اور اسی نام سے شعر کہنے لگا۔ کوئی آٹھ دس سال بعد معلوم ہوا کہ مجھ سے سینکڑوں برس پہلے فارسی میں ایک مجنوں مشہدی گزر چکے ہیں جو غالباً جامیؔ کے ہم عصر تھے اور جو اتنے برگزیدہ اور قابل احترام تھے کہ تذکرہ نگار ان کے نام کے ساتھ مولانا کا اضافہ کرنا اداب کی رو سے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر اس وقت بھی مجھے یاد آ رہا ہے:

وارِی روم وزار زاری گریم

بدیں بہانہ زہجرانِ یار می گریم

اسی زمانے میں یہ بھی پتہ چلا کہ اردو میں بھی ایک مجنوں گزر چکے ہیں جو میر تقی میر کے شاگردوں میں تھے اور اتنے اچھے شعر کہتے تھے کہ میرؔ جیسے بے دماغ نے ان کو اپنی شاگردی میں لے لینا مناسب سمجھا۔ یہ مجنوں عظیم آبادی تھے۔ میر حسن ان کو میر ضیا کا شاگرد بتاتے ہیں۔ ان کا بھی ایک شعر سننے کے لائق ہے:۔

دن میں سو سو بار اس کے روبرو جانا مجھے
اس میں سودائی کہے یا کوئی دیوانہ مجھے

میرے پندار کو ان انکشافات سے جو صدمہ پہنچا اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کرسکتا۔ بس یہ جی چاہتا تھا کہ ڈوب مروں۔ مشکل یہ تھی کہ بات قابو سے باہر ہو چکی تھی اور میں کاغذ اور سیاہی کی دنیا میں مجنوں مشہور ہو چکا تھا۔ ایک تسکین یہ تھی کہ چلو میرے سوا بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اس تخلص کا کوئی اور شخص گزر چکا ہے مگر یہ تسکین بھی نہیں رہی۔ میرے بعد ایک لکھنوی حضرت کو بھی شوق ہوا کہ وہ اپنے کو اس تخلص سے رسوا کریں۔ میں ان کی ہمت اور توفیق کی داد دیتا ہوں۔

مجنوں تو میں ضرور ہوا لیکن یقین مانئے کسی مقامی نسبت کا خیال دور تک میرے ذہن میں نہیں تھا اور اس کا الزام میرے سر نہیں آتا۔ میں اپنے کو اس زمانے میں کسی مخصوص جگہ سے منسوب کر ہی نہیں سکتا۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب کہ انسان کی نظر بلند ہوتی ہے اور اس کے فکر و احساس میں کائنات سموئی ہوتی ہے۔ میری تخیل بیحد وسیع اور ہمہ گیر تھی اور میں اپنے تخیل کے نشے میں چُور تھا، مصلحت اندیشی اور مصالحت کوشی کا منزلوں زندگی میں پتہ نہ تھا اس زمانے میں واقعی:۔

اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا

اور فضا کے پیچ وخم میں تھک کر رہ جانے کا دھندلے سے دھندلا اندیشہ نہیں تھا۔ میں بڑے حوصلے اور بڑے نشاط کے ساتھ محسوس کرتا تھا اور بڑے زعم کے ساتھ دعویٰ تھا کہ:۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

جب پہلے پہل میں نے اقبال کا یہ شعر پڑھا تو میں اپنی تخیل کھو چکا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کہیں سے وہ پھر مجھے پکار کر اپنا سراغ دے رہی ہے پھر ایسا آدمی جو صدق دل سے اپنے کو ایک ''مرد آفاقی'' سمجھ رہا ہو اپنے نام کے آگے گورکھ پوری کیسے لگا سکتا تھا؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اردو کے اخبار و رسائل نے میرے نام کے آگے اوّل اوّل گورکھپوری کا اضافہ کیا۔ اس لئے کہ میرے مراسلات گورکھ پور ہی کے ڈاک سے روانہ ہوتے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ پھر عرصہ تک یہ ہوتا رہا کہ میں اپنے کو صرف ''مجنوں'' لکھتا رہا اور رسالے برابر 'مجنوں گورکھ پوری' چھاپتے رہے۔ یہاں تک کہ مجنوں گورکھ پوری مشہور ہو گیا

اور مجھے بھی اس کو قبول ہی کر لینا پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ میں گورکھ پوری ہوں یا نہیں' جواب میں اگر اصرار کے ساتھ کہوں میں گورکھ پوری ہوں تو کوئی منطقی یا قانونی غلطی نہ ہوگی' لیکن جو مجھ سے یہ سوال کرتے رہے ہیں اور جن کو مجھے گورکھ پوری ماننے میں تامل ہے وہ بھی بہت بڑی حد تک حق بجانب ہیں۔ میرا خمیر یقیناً بستی کی خاک سے ہوا ایک دور افتادہ اور سیلاب زدہ گاؤں میں' جو گھاگھرا اور کنوانوں کے کنارے تحصیل خلیل آباد ضلع بستی میں واقع ہے اور پلدہ عرف ملکی جوت کہلاتا ہے' پیدا ہوا جہاں متمدن اور تعلیم یافتہ لوگوں کا بہت کم گزر ہوتا تھا۔ میری ددھیال یہی سرزمین ہے جہاں بدویت اور بربریت کے جملہ علامات وآثار اب تک اسی طرح پائے جاتے ہیں' جس طرح اب سے سو سال پہلے پائے جاتے تھے۔

مگر میری تربیت اور میرے مزاج و کردار کی تعمیر بستی ہی کے دوسرے موضع میں ہوئی جو خلیل آباد اور گھر کے درمیان لکھنؤ جانیوالی پختہ سڑک کے کنارے واقع ہے اور منجھریا کہلاتا ہے۔ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر آمی ندی کے کنارے گورکھ پور اور بستی کی سرحدیں ملتی ہیں' یہ جوار واقعی میری تربیت گاہ ہے جہاں میں اپنی دادی کے ہاتھوں وہ بنا جو آج تک ہوں۔ عرصے سے یہاں آنا جانا چھوٹا ہوا ہے لیکن میری روح اس چھوڑے ہوئے دیار کی طرف اب بھی بے ساختہ کھنچتی رہتی ہے اسکے ساتھ میرے بڑے نازک جذبات اور میری بلندترین تخیلوں کی یادیں وابستہ ہیں ۱۰۲۳ یا ۱۹۲۴ء میں ایک چھوٹی سی نظم اسی کی یاد میں کہی گئی تھی جس کے دو اشعار یہ ہیں:۔

دفن تیری جھاڑیوں میں میرے دل کا راز ہے
تیری ہر موج ہوا میں میری ہی آواز ہے

☆

تیرا ہر گوشہ کہ منزل گاہِ الہامات ہے
مکتب عرفاں ہے یا گہوارۂ جذبات ہے

یہیں میں نے ۱۴ سال کی عمر تک بہترین تعلیم پائی' یہیں میرا شعور بالغ ہوا اور یہیں میرے اندر وہ ذوقِ جمال پیدا ہوا جو تمام مخالف حادثات وحالات کے باوجود آج تک جی کا روگ بنا ہوا ہے یہی علاقہ میرے افسانوں کا جغرافیہ ہے اور اسی جگہ میرے بہترین افسانے لکھے گئے۔ جب میں انگریزی تعلیم کے

لئے گورکھ پور چلا آیا' اس طرح کہ پھر زیادہ تر گورکھ پور رہنے لگا تو بھی ایک مدت تک کوئی بڑی یا چھوٹی تعطیل ایسی نہیں ہوتی تھی جو میں یہاں آ کر نہ گزارتا رہا ہوں۔ مختصر یہ کہ ''مٹی اور روح'' (The Soil And The Soul) کے درمیان اندرونی نسبت اور باطنی اختلافات سے جو انکار کرے اس کو قائل کرنے کے لئے جہاں اور سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں وہاں ایک زبردست مثال میں بھی ہوں۔ طرح طرح کے حائلات و موانع عرصہ سے مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنے دل و دماغ کی اس اوّلیں تربیت گاہ کی طرف پھر رجوع کروں میں اپنی علمی اور ظاہری زندگی میں عرصہ سے کہنے کے لئے اس کو بالکل فراموش کئے ہوئے ہوں مگر میری ہستی کی ایک ایک تہہ میں اس کی یاد بستی ہوئی ہے اور ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا کہ میں اس یاد سے بے چین نہ رہتا ہوں۔

اگر میری ابتدائی پرورش اور تعلیم بستی میں ہوئی تو میری تعلیم کی تکمیل گھور کھپور میں ہوئی اور پھر نہ صرف میں بلکہ میرے خاندان کے تمام قریبی رشتے دار معاش اور کاروبار کے سلسلے میں گورکھ پور میں رہے اگر میں صرف اتنا کہہ دوں کہ بستی میرا اصل وطن سہی گورکھ پور میرا وطن مالوف ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے لیکن اتنا ہی نہیں ہے اصلیت اس سے بہت زیادہ ہے اور جو نسبت مجھے گورکھ پور سے ہے اس کی جڑیں زیادہ گہری اور مضبوط ہیں۔ میری ددھیال ضلع بستی میں ہے اور ننہیال شہر گورکھ' دادا اور باپ کی طرف سے میں گورکھ پور کا ہوں۔ اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ بیک وقت مجھے بستی اور گورکھ پور دونوں سے نسبت ہے وہ تنہا میری ذات سے نہیں بلکہ دو پشت پرانی ہے۔ میری دادی جن کا ذکر میں ایک سے زائد بار کر چکا ہوں گورکھ پور کے ایک ایسے خاندان کی تھیں جو علم و فضل اور فقر و درویشی میں اپنا ایک ممتاز مرتبہ رکھتا ہے۔ خود میری دادی فاضل اور درک و بصیرت رکھنے والی ہستی تھیں۔ عورتیں تو ایک طرف مردوں میں بھی بہت کم لوگ نکلیں گے جو ایسی پختہ اور جید شخصیت کے مالک ہوں۔ میری تربیت انہیں نے کی اور عربی فارسی ہندی میں مجھے جو کچھ استعداد ہے وہ انہیں کی دین ہے۔

مجھے اپنے گورکھ پوری یا غیر گورکھ پوری ہونے کے بارے میں' جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا' اب لوگ جو چاہیں سمجھیں' اور مجھے جہاں سے چاہیں منسوب کریں۔ میں نے اپنی باشعور عمر کا وہ حصہ جس کے لئے سعدیؔ نے عمر عزیز کے چالیس سال کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ گورکھ پور ہی میں بسر کیا لیکن جس سرزمین کو میری زاد بوم ہونے کی برکت یا نحوست حاصل ہے اس سے اصلی اور اندرونی طور پر میں کبھی بھی

اپنا دل نہ ہٹا سکا۔ اس کا خیال اور اس کی یاد اب تک میرے دل کا داغ بنی ہوئی ہے اور آج جب کہ انتہائی ضبط سے کام لے کر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں میرے قلب و روح کی جو کیفیت ہے اس کو رومی کی 'بانسری' ہی کی آواز میں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اس کو رجعت میلان یا ماضی پرستی کی علامت سمجھیں لیکن بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف واقعات ہی سمجھنا چاہیئے اور خواہ مخواہ ان کی تاویل میں وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو عمر طبعی پر پہنچ کر شوق سے کہہ سکیں کہ "کارے کردم" اگر مجنوں صاحب یہ دعویٰ کریں تو وہ حق بجانب ہیں۔

پچاس سال کی طویل مدت تک درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے وسیلے سے ادب آموزی کرنا بذات خود ایک کارنامہ ہے' کارنامہ ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے' یوں جدید اردو ادب کی رہنمائی میں جن نقادوں نے اہم کردار ادا کیا ہے' ان میں مجنوں صاحب کی حیثیت بہت ممتاز اور نمایاں ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی ڈائری سے ایک صفحہ

کنور کوٹ

(کیا اور کیوں؟)

فراق گورکھپوری۔ جن کو میں رگھوپتی پکارتا ہوں کہا کرتے ہیں کہ میں احساس و تاثر سے زیادہ تامل و تفکر کا آدمی ہوں۔ وہ میرے تخلیقی مزاج کے قائل رہے ہیں۔ اسی لئے جب میں شوپنہار، تاریخ جمالیات، فلسفہ، یوناہنرگساں جیسے موضوعات پر کچھ لکھتا ہوں تو وہ زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ وہ میرے افسانوں میں بھی یہی خصوصیت حاوی پاتے ہیں۔۔

ان کا خیال ہے اور غلط نہیں ہے کہ میرا مزاج تحلیلی یا توضیحی ہے، تمثیلی یعنی ڈرامائی نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے افسانوں میں مکالمات کم ہوتے ہیں، بیانات زیادہ ہوتے ہیں۔

میرے مختصر افسانوں میں "گہنا" اور طویل افسانوں میں "سوگوار شباب" فراق کو بہت پسند تھے۔ ایک دن ان کا خط ملا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ وہ "سوگوار شباب" کا ہندی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ میں خوش ہوا مگر اس تردد میں بھی پڑ گیا کہ وہ کسی طالب علم یا نومشق استاد کو بول کر لکھا رہے ہوں گے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ مسودہ مطبع کے حوالے کرنے سے پہلے میرے پاس بھیج دو تاکہ میں ایک نظر ڈال لوں۔ جواب خاصی تاخیر سے ملا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ پریس کو جلدی تھی اور ان کو کچھ رقم کی فوری ضرورت تھی جو انھوں نے حاصل کر لی ہے۔

مجنوں گورکھپوری کے صاحبزادے

انجینئر ظفر عالم سے گفتگو

جمال نقوی

اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت، شاعر، افسانہ نگار اور مستند نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں میرے استاد بھی رہے اور کراچی میں بھی جن سے میں فیض حاصل کرتا رہا، ان کے بڑے صاحبزادے جو تعلیمی اعتبار سے میرے ہم پیشہ یعنی انجینئر اور ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے ریٹائرڈ جنرل منیجر ہیں اور آج کل سرسید یونیورسٹی کے ذیلی ادارے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں شعبۂ تدریس سے منسلک ہیں، اُن سے مجنوں صاحب کے بارے میں ایک گفتگو پیش خدمت ہے۔

جمال:۔ ظفر عالم صاحب آپ اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ظفر:۔ میں ابتداً آرٹس کا طالب علم رہا اور میں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ اس کے بعد سائنس اور انجینئرنگ میں داخل ہو گیا۔ تبدیلی کی اس خواہش پر والد سے ڈانٹ بھی کھائی، کہ میں نے پہلے ہی فیصلہ سوچ سمجھ کر کیوں نہیں کیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں علیگڑھ سے میں نے الیکٹریکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ میرے استادوں میں جناب عبید اللہ درانی، سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کا نام بھی شامل ہے۔

جمال:۔ ظفر صاحب کچھ اپنے والد مجنوں گورکھپوری کے بچپن کے بارے میں بتائیں۔

ظفر:۔ مجنوں صاحب کا بچپن منجھریا گاؤں میں گزرا جو ضلع بستی میں واقعہ ہے اور جس کی تحصیل خلیل آباد ہے، جو میر خلیل الرحمان حاکم مقرر کردہ اورنگ زیب عالمگیر کے نام پر ہے۔ یہ مجنوں صاحب نے مجھے بتایا تھا۔

جمال:۔ ظفر صاحب آپ کی پیدائش کب ہوئی اور اس زمانے میں مجنوں صاحب کی کیا معروفیات تھیں؟

ظفر:۔ میری پیدائش جون ۱۹۳۰ء کی ہے اور اس وقت میرے والد اپنی تعلیم اور تصنیف و تالیف میں مصروف تھے۔

جمال:۔ مجنوں صاحب آپ کے والد ہونے کے علاوہ آپ کے استاد بھی رہے۔ بحیثیت استاد انہیں آپ نے کیسا پایا؟

ظفر:۔ انٹر اور بی۔اے میں مجنوں صاحب نے ہمیں علامہ اقبال کی نظمیں طلوع اسلام، کنار راوی اور خضر راہ پڑھائیں جس کی وجہ سے مجھے اقبال سے محبت ہوگئی۔ کیوں کہ وہ تفصیل سے گفتگو کرتے تھے اور عام مطالب سے ہٹ کر مطلب بتاتے تھے اور الفاظ کے تلفظ پر بہت زور دیتے تھے۔

ایک بار یوں ہوا کہ کنار روای کا ایک مصرع:۔

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی

جسے ایک لڑکے نے سَرُود اور دوسرے نے سُرور پڑھا۔ جس پر وہ اتنے خفا ہوئے کہ کلاس چھوڑ کر چلے گئے ورنہ اگلا نمبر میرا تھا یوں میں بچ گیا۔

جمال:۔ شاعر ادیب اور پروفیسر کے علاوہ مجنوں صاحب کی شخصیت کا دوسرا رخ ایک باپ کا بھی تھا۔ آپ ان کی شخصیت کے اس رخ پر بھی روشنی ڈالئے۔

ظفر:۔ دادا جان اور والد صاحب کی شخصیت کا رعب اور دبدبہ ایسا تھا کہ ہم سب ان سے بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ میں اپنی بات اپنی ماں اور پھوپھی کے توسط سے کرتا تھا۔ وہ بدحواسی سے بہت چڑتے تھے۔ ایک مرتبہ کلاس میں منہ میں پنسل لینے پر انہوں نے مجھے ڈانٹا تھا۔

جمال:۔ ادبی حلقوں میں گورکھ پور کی پہچان مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری سے ہوتی ہے۔ آپ بتائیے کہ ان دونوں نابغۂ روزگار شخصیات کے تعلقات کیسے تھے؟

ظفر:۔ فراق صاحب کے والد منشی گورکھپور پرشاد عبرتؔ کا گھر ہمارے پڑوس میں تھا لیکن فراق صاحب بھی الٰہ آباد سے آتے تو میرے دادا جان مولوی محمد فاروق دیوانہؔ کے گھر ضرور آتے۔ فراق صاحب اور مجنوں صاحب ادب کے دیگر مسائل پر گفت و شنید کے ساتھ ہی اپنی شاعری بھی سنایا کرتے تھے اور اس گفتگو میں دوسرے بھی شریک ہوجاتے۔ بعد میں فراق صاحب کو میں نے مشاعروں اور اپنے کالج کی محفلوں میں سنا۔ ان کے بہت سے اشعار مجھے یاد ہیں۔ ایک آپ بھی سنئے:۔

منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں

وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

جمال:۔ مجنوں صاحب نے بھی تو ابتدا شاعری سے کی تھی' اس کے بعد افسانہ اور تنقید کی طرف آئے۔ کچھ اشعار ان کے بھی تو سنائیں۔

ظفر: مجنوں صاحب نے اپنی شاعری کا کوئی مجموعہ تو نہیں چھپوایا مگر تخلیقات اس وقت کے رسائل اور جرائد میں چھپتی رہتی تھیں۔ وہ مشاعروں میں بھی بہت کم جاتے تھے۔ ان کے چند اشعار سنئے:۔

آپ کی بے مہریاں اے مہرباں دیکھا کئے

عمر بھر راہِ وفا کی سختیاں دیکھا کئے

کچھ طبیعت ہی تھی اپنی مائلِ افسردگی

ہم لٹا کر فصل گل رنگِ خزاں دیکھا کئے

ان کے کلام کا ایک منتخب حصہ جناب شبنم رومانی نے 'ارمغانِ مجنوں' میں جمع کیا ہے۔

جمال:۔ ظفر صاحب اپنی یادداشت کے سہارے ہمیں بتائیں کہ ادب کی اور کون سی اہم شخصیات آپ کے گھر آتی رہتی تھیں؟

ظفر:۔ جگر مراد آبادی بھی اکثر آیا کرتے تھے۔ ان کی دوستی میرے دادا مولوی محمد فاروق دیوانہ سے بھی تھی۔ ہمارے دادا کا ایک خادم عبدالحق (ھقا) ہر مرتبہ جگر صاحب سے فرمائش کر کے ان کی کوئی غزل تحریری طور پر لیتا اور اسے فریم کروا کے رکھ لیتا۔ جگر صاحب کو بھی میں نے مشاعروں میں خوب سنا۔ ان کے چند شعر سنئے:۔

جلوہ بقدرِ ظرفِ نظر دیکھتے رہے

کیا دیکھتے ہم ان کو' مگر دیکھتے رہے

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے

ہم تھے کہ انتظارِ سحر دیکھتے رہے

ایک بار مجنوں صاحب سحر انصاری صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ تشریف لائے تو انہوں نے جگر مراد آبادی کا یہی شعر انہیں پڑھ کر سنایا تھا۔

جگر صاحب کے علاوہ جن آنے والوں کے نام میرے ذہن میں موجود ہیں ان میں ذوقی صاحب، شوکت تھانوی، ساغر نظامی، عندلیب شادانی، جوش ملیح آبادی اور مجاز وغیرہ شامل ہیں۔

جمال: مجنوں صاحب کی افسانہ نگاری اور تنقید کے بارے میں بھی کچھ بتائیں؟

ظفر: افسانہ نگاری تو انہوں نے چیلنج کے طور پر اختیار کی تھی لیکن انہوں نے بہت کامیاب افسانے تحریر کئے۔ تنقید میں ان کا مقام سب سے بلند ہے اور اب یہی ان کی پہچان بنی۔ تنقید کے بارے میں انہوں نے ایک بار کلاس میں کہا:۔

"جگر کے اشعار میں اچانک پن ہے، فانی کی شاعری پڑھ کر ہمت پیدا ہوتی ہے اور اقبال کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا کوئی بھی شعر نازک ساز پر گایا جاسکتا ہے، ان کے اشعار میں موسیقیت اور آہنگ ہے"

جمال:۔ چیلنج کی کچھ تفصیل بھی بتائیں۔

ظفر:۔ واقعہ مختصراً یوں ہے کہ جمیلہ بیگم بنت مہدی حسن افادی (میری ممانی) نیاز صاحب کی سلسلہ وار تحریر "شہاب کی سرگزشت" نگار میں بڑے شوق سے پڑھتی تھیں۔ ایک بار والد صاحب نے پوچھا کہ اس میں اتنی کیا خاص بات ہے کہ آپ اس تحریر کا اتنا انتظار کرتی ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا یہ سب نہ لکھ سکنے کی باتیں ہیں۔ اسی دن والد صاحب نے ایک افسانہ "زیدی کا حشر" (آدھا حصہ) لکھ کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ جس پر انہوں نے مسکرا کر کہا کہ تم سے لکھوانے کا یہی طریقہ تھا۔ اس عرصے میں نیاز صاحب گورکھپور آئے تو انہوں نے اس افسانے کو لے کر اپنے پاس رکھ لیا اور والد صاحب سے کہا کہ تم اسے مکمل کر کے دو یہ نگار میں مسلسل چھپے گا۔ اس طرح افسانہ نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔

جمال: یہ بتایئے کہ کیا جمیلہ بیگم کی خود اپنی بھی کچھ تخلیقات ہیں؟

ظفر: چونکہ جمیلہ بیگم کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے تھا اور وہ خود بھی ادبی تحریروں کی قاری تھیں اس لئے ان میں ادبی صلاحیت یقیناً تھی۔ وہ شاعرہ تھیں اور ناہید تخلص رکھتی تھیں۔ ان کے اشعار میں نے خود ان سے اور دوسروں سے بھی سنے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت کی تہذیب کے لحاظ سے شاید ان کا کلام کہیں شائع نہیں ہوا۔ مگر بہت سے ان لوگوں کے ذہنوں میں ضرور موجود ہوگا۔ جنہوں نے میری طرح ان سے یا دوسروں سے سنا ہے۔ میری یادداشت میں باقی ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

روز کچھ نیا ستم ایجاد
آپ کے ہاتھ میں خدائی ہے
بارِ عصیاں سے دب گئی یارب
میرے مولا تری دہائی ہے
کیسے انجان بن کے بیٹھے ہو
پارسائی سی پارسائی ہے

☆

کروں کیسے میں ہمت بزم میں اس بت کے جانے کی
کہ عادت ہوگئی ہے میری اب رونے رلانے کی
عبث اوراقِ پارینہ کے چکر میں تو' ہمدم ہے
ضرورت ہے نئی تاریخ اب ہم کو سنانے کی
زمانے سے ہے موت وزندگی کی کشمکش جاری
سزا ناہید نے پائی ہے یہ دنیا میں آنے کی

جمال:۔ ظفر صاحب کیا آپ کے علم میں ہے کہ مجنوں گورکھپوری پر کتنے لوگوں نے مضامین لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی مکمل کی ہے۔

ظفر:۔ اتنی تفصیلات تو مجھے نہیں معلوم۔ ہاں! یہ معلوم ہے کہ والد صاحب کے چہیتے شاگرد ملک زادہ منظور احمد نے سب سے پہلا مضمون ''مجنوں گورکھپوری بحیثیت انسان'' تحریر کیا اور ابھی حال ہی میں گورنمنٹ کالج چشتیاں' بہاولنگر کے ڈاکٹر عبدالستار نیازی کی پی ایچ ڈی کا موضوع بھی مجنوں گورکھپوری کے بارے میں تھا۔ اس کے علاوہ شاید ہندوستان میں بھی کچھ لوگوں نے تحقیقی مقالے تحریر کئے ہیں۔

جمال:۔ اچھا یہ بتایئے کہ مجنوں صاحب قسمت یا محنت کے قائل تھے؟

ظفر:۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سنئے۔ ایک بار میں خاموش بیٹھا ہوا تھا اور اپنے مقدر کو کوس رہا تھا۔ اس پر انہوں نے کہا:۔

''آئندہ مقدر کی شکایت نہ کرنا۔ جانتے ہو! مقدر انسان کے حالات اور اس کے مزاج کی رگڑ سے پیدا ہوتا ہے''

جمال:۔ مجنوں صاحب کی تدریسی کارکردگی اور علیگڑھ کے تعلق سے بھی کچھ فرمائیں؟

ظفر:۔ دادا جان اور والد صاحب غالباً ۱۹۳۰ء میں مسلم یونیورسٹی' علیگڑھ میں استاد رہے۔ والد صاحب غالباً ۱۹۵۸ء میں دوبارہ ہسٹری آف اردو لٹریچر کے شعبے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ اس وقت آل احمد سرور صاحب اردو ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین تھے۔ ۱۹۶۸ء میں علیگڑھ سے پاکستان آئے اور کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ایمرٹس رہے۔

جمال: یہ بتائیے کہ ادب سے مجنوں صاحب کی محبت ان کے بچوں میں کہاں تک منتقل ہوئی۔

ظفر: میرے دو چھوٹے بھائی اور ایک بہن ہیں۔ لیکن سوائے بدر عالم راحل کے یہ خصوصیت اور کسی میں نہیں آئی۔ وہ شاعری کرتا تھا اور اس کا بہت اچھا ترنم بھی تھا۔ اس نے بمبئی فلم انڈسٹری میں نغمے تحریر کئے۔ اس کے نغمے محمد رفیع نے بھی گائے ہیں۔ غالباً اسی کا شعر ہے آپ بھی سنیں:۔

جس کو ملتا نہیں غمِ جاناں

ایسے عاشق شراب پیتے ہیں

جمال:۔ ظفر صاحب بہت شکریہ۔ آپ نے اپنے والد مجنوں گورکھپوری کی نجی زندگی کے بارے میں بہت اہم معلومات فراہم کیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر کچھ بتانا چاہیں؟

ظفر:۔ جمال صاحب آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔ ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ کبیر داس ہمارے گاؤں کے قریب ہی رہتے تھے۔ ان کی سمادھی اور مزار ساتھ ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ میرے گاؤں کے پیچھے ایک نالہ تھا جسے 'کدوا' کہتے تھے۔ میرے والد نے بتایا تھا کہ گوتم بدھ نے اس نالے کو کود کر پار کیا تھا۔ اس سے اس کی عظمت کا پتہ چلتا ہے اور اسی لئے اسے کدوا کہا جاتا ہے۔

باتیں تو بہت سی ہیں لیکن جو کچھ فوری طور پر یاد تھا وہ بتا دیا۔ باقی آئندہ کسی نشست میں بات ہوگی۔

جمال: شکریہ ظفر عالم صاحب۔ یقیناً اس سے مجنوں صاحب کی شخصیت کے کچھ اہم پہلو نمایاں ہوں گے۔

......☆......

مجنوں گورکھپوری کی شخصیت کی چند جھلکیاں / پروین کاظمی

مجنوں گورکھپوری بحیثیت شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور استاد بیسویں صدی کا ایک بڑا نام ہیں۔ وہ ہمہ جہت اوصاف کے مالک تھے۔ کسی ایک شخص میں اتنے پہلوؤں کا جمع ہوجانا بجائے خود ایک بڑی خصوصیت ہے۔

ان کا ہر رنگ جدا مگر مسلم تھا۔ مگر اس وقت میں ان کی شخصیت کے جس رنگ اور جس پہلو پر روشنی ڈالنے جارہی ہوں وہ ہے ایک استاد کی شخصیت کا رنگ۔ مجھے اتنے برس گزر جانے کے باوجود آج تک یاد ہے کہ سفید لباس میں ملبوس دبلے پتلے سے مجنوں صاحب اپنی چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ شعبۂ اردو کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کرتے تو ان کے سارے شاگرد جو لڑکے ہوتے فوراً اپنے گریبانوں کے بٹن بند کرنا شروع کردیتے کیوں کہ ان کو گریباں چاک پسند نہیں تھا۔ اسی طرح جب وہ کلاس میں آتے تو ہر طرف سکوت طاری ہوجاتا کسی کو جرأت نہ تھی کہ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرے یا کلاس کا سکون برباد کرسکے۔ ہاں جب وہ اپنا لکچر پورا کرلیتے تو پھر ہر شاگرد کو اجازت تھی کہ وہ اس مضمون کے بارے میں جو سوال چاہے کرے۔

میں مجنوں صاحب کو ان کے گھر کے حوالے سے بھی جانتی ہوں، کیوں کہ میں ان کے گھر جاتی تھی اور وہ بارہا میرے گھر آئے۔ خوراک بالکل نہ ہونے کے برابر، البتہ کالی کافی انھیں بہت پسند تھی، جو وہ اپنی اہلیہ حمیرا بیگم سے کہہ کر بہت ذوق وشوق سے بنواتے تھے۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ بظاہر بڑے پرسکون نظر آتے تھے، مگر ان کے اندر کی اضطرابی کیفیت کبھی کبھی اتنی شدید ہوجاتی کہ وہ بولتے بولتے بالکل چپ ہوجاتے۔ صرف ان کی انگلیوں کی حرکت اور ہونٹوں کی تھرتھراہٹ ان کے اندرونی اضطراب کی نشاندہی کرتی۔

وہ میر تقی میر، غالب اور ہارڈی سے بہت متاثر تھے۔ ہم ان سے علم وادب کے علاوہ دیگر سینکڑوں موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ ان کی بات چیت سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس مرد کو ناپسند کرتے تھے جو روزانہ شیونہ کرتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے بھی چڑتے تھے جو دوسری شادی کرتے تھے۔ خواہ وہ پہلی بیوی کی زندگی میں ہو یا مرنے کے بعد۔ عشق کو آدمی کی معراج جانتے تھے۔ اکثر میں نے ان سے پوچھا: سر!

آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ نہیں۔ ہاں یہ ضرور کہتے تھے کہ اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔

اپنی پسند اور ناپسند ان کے لئے بہت اہم بات تھی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ کسی صاحب حیثیت شخص سے متاثر ہو جائیں۔ البتہ علم کا شوق رکھنے والوں سے متاثر ہوتے۔ چونکہ وہ خود ایک نفیس ترین انسان تھے اس لئے سلیقہ مندی اور شائستگی کو پسند کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک پڑھا لکھا شخص گھاس بھی کاٹے گا تو اس میں بھی سلیقہ نظر آئے گا۔

وہ بڑوں کا احترام کرتے اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔ شاگردوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان شاگردوں سے بھی جو ابن الوقت تھے اور ان سے بھی جو آج بھی مجنوں صاحب کا نام آتے ہی کھو جاتے ہیں کہ ان کے کس کس پہلو کو یاد کیا جائے۔

مذہبی طور پر وہ کس طرح کے تھے کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ مگر میں نے بھی کبھی مذہبی امور پر ان سے تبادلہء خیال نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ۔

جائے ہے جی نجات کے غم میں

ایسی جنت گئی جہنم میں

اپنے بیٹوں میں وہ ظفر عالم صاحب سے بہت محبت کرتے تھے اور اپنے ایک نواسے کو جسے وہ پیار سے "سہراب جی" کہتے تھے چاہتے تھے۔ اپنی اہلیہ کے بارے میں کہتے تھے کہ میں حمیرا سے بہت محبت کرتا ہوں۔ کاش وہ میرے سامنے مر جائے کہ میرے بعد اس سے کوئی اتنی محبت نہیں کرے گا اور نہ ہی اتنا خیال رکھے گا جتنا میں رکھتا ہوں۔

اپنی ذات پر انھیں بڑا اعتماد تھا۔ بیس سال کی عمر میں ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ تمہارا ایک پھیپھڑا ناکارہ ہو چکا ہے مگر آخری عمر تک وہ پان سے بھی شوق فرماتے تھے اور سگریٹ بھی پیتے تھے۔ آنکھوں سے کم نظر آنے لگا تھا مگر وہ کہتے تھے کہ پروین، اگر میں دونوں آنکھوں سے اندھا بھی ہو گیا تو کم از کم اپنے اور حمیرا کے لئے اتنا کما لوں گا کہ اپنی ضروریات کو باآسانی پورا کر سکوں۔ بے حد غیور انسان تھے۔ میں نہیں سمجھتی کہ انھوں نے اپنی اولاد سے کچھ لیا ہوگا۔ ہاں ان پر خرچ ضرور کیا ہوگا۔

اگر کبھی میں اس طرح ان کے گھر جاتی کہ دروازے پر کوئی مجھے چھوڑ کر چلا جاتا کہ ہم ایک گھنٹے

میں واپس آجائیں گے اور تمہیں لے لیں گے تو ان کی بے چینی عروج پر ہوتی۔ کہتے اکیلی مت جانا، وہ تمہیں ضرور لینے آجائیں گے۔ میں کہتی آخر یونیورسٹی بھی تو اکیلی ہی جاتی ہوں نا۔ مگر وہ بالکل نہیں مانتے۔ وہ کہتے میں خود تمہیں چھوڑ کر آؤں گا۔ یہ باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ دوسروں کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ جب میرا بھائی مجھے لینے کے لئے آجاتا تو وہ بالکل مطمئن ہو جاتے۔ ہاں اب ٹھیک ہے، آرام سے باتیں کرو۔ بے حد مہمان نواز بھی تھے۔ جو بھی ان سے ملنے آتا اس کی چائے بسکٹ وغیرہ سے تواضع کرتے اور اصرار کر کے کھلاتے پلاتے۔

میں نے ان کو کبھی کسی کے بارے میں منفی گفتگو کرتے نہیں سنا۔ وہ کسی کی برائی کبھی نہ کرتے، نہ ہی وہ کبھی تیوریوں پر بل ڈال کر بات کرتے تھے۔ جو بات اچھی ہے اچھی ہے اور جو بات ان کو بری لگتی، اس کا ذکر کبھی نہ کرتے۔

ریاض خیر آبادی کا ایک شعر تھا جس کا پس منظر سحر انصاری صاحب نے ان کی کتاب ''ارمغان مجنوں'' میں پیش کیا ہے۔ شعر ہے۔

جسے تم کوستے ہو عمر اس کی اور بڑھتی ہے

تمہیں سب کچھ تو آیا کوسنا اب تک نہیں آیا

ہم اس کے دوسرے مصرے کو ذرا ترمیم کر کے حسب موقع یوں استعمال کیا کرتے تھے۔

تمہیں سب کچھ تو آیا ڈانٹنا اب تک نہیں آیا

مجنوں صاحب کو جب یہ ترمیم شدہ مصرعہ سناتے تو وہ سن کر بہت لطف اندوز ہوتے، تھوڑا سا مسکراتے، آہستہ سے گردن ہلاتے۔

وہ کئی مضامین میں ایم۔ اے۔ تھے۔ علم کا سمندر تھے۔ کسی موضوع پر گفتگو کر لیں وہ آپ کو انتہا تک پہنچا کر دم لیں گے۔

دوستی فراق گورکھپوری سے تھی۔ ہندوستان میں ان کا ساتھ رہا۔ پاکستان آنے کے بعد وہ کئی نام لیتے تھے۔ مگر جو اداسی فراق کے نام کے ساتھ وابستہ تھی وہ کسی اور کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے کہ فراق میرے لئے ہندوستان میں اداس اور دکھی ہے۔ (باقی صفحہ 127 پر)

اُس کے جنوں کی داستاں

میرے والد۔۔۔مجنوں گورکھپوری / محمد ظفر عالم

میرے والد مجنوں گورکھپوری کے بارے میں وہ لوگ بہتر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں جو اہل ادب ہیں یا جنھوں نے ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی صحبت میں بیٹھتے رہے ہیں۔ان چند لوگوں کے نام جو سرفہرست ہیں ان میں مختار زمن صاحب مرحوم، شبنم رومانی صاحب، اور سحر انصاری صاحب ہیں جو اہل قلم بھی ہیں اور والد صاحب کے ساتھ بہت وقت گزارا ہے۔اس ضمن میں اقبال حیدر صاحب کا ذکر آتا ہے، جنھوں نے والد صاحب کے کتنے ہی پروگرام ٹی وی پر کرائے۔اور خود بھی والد صاحب کی صحبت میں کافی وقت گزارا۔

گھر پر والد صاحب سے بہت سے لوگ ملنے آتے تھے اور ہر ماہ والد صاحب کی دلبستگی کے لئے ادبی محفلیں منعقد ہوتی ہی رہتی تھیں۔ جنھیں شان الحق حقی صاحب مرحوم، محمد علی صدیقی صاحب، ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب اور بہت سی ادبی شخصیتیں ان کے علاوہ ان محفلوں میں شریک ہوتی رہتی تھیں۔

شبنم رومانی صاحب اور صہبا لکھنوی صاحب مرحوم نے "ارمغان مجنوں" کی دو جلدیں شائع کر کے والد صاحب کی بہت سی باتوں اور خوبیوں کو یکجا کر دیا ہے۔جن سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے۔"ارمغان مجنوں" آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔

والد صاحب کے انتقال پر بہت سے لوگوں نے لکھا مگر سب سے پہلی تحریر جو میری نظر سے گزری وہ خوش بخت شجاعت صاحبہ کی تھی۔"اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں" کے عنوان سے غالباً کسی اخبار میں شائع ہوئی تھی۔اور انھوں نے میرے والد صاحب "چہرے" پروگرام کے کرنے کے سلسلے میں والد صاحب کے ساتھ کتنی ہی نشستیں کی تھیں۔اور وہ کافی حد تک والد صاحب کی شخصیت سے آگاہ ہو گئی تھیں۔

چند باتیں والد صاحب کی اکثر یاد آتی ہیں۔ایک دفعہ میں کچھ اداس بیٹھا ہوا تھا، انھوں نے کہا کہ کیوں خاموش بیٹھے ہو؟ میں نے کہا اگر انسان کا مقدر ہی خراب ہو تو وہ کیا کرے۔اس پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ آئندہ مقدر کی شکایت نہ کرنا۔جانتے ہو مقدر کیا چیز ہے۔میں نے کہا آپ ہی بتایئے کہنے لگے مقدر انسان کے مزاج اور اس کے حالات کے رگڑے سے پیدا ہوتا ہے۔ایسی ہی ان کی بہت ساری باتیں قابل ذکر ہیں۔اس سلسلے میں سحر انصاری صاحب اور شبنم رومانی صاحب بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔سحر

انصاری صاحب نے ابھی چند دنوں پہلے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے لگتا ہے کہ مجنوں صاحب ہمارے ساتھ ہیں۔

والد صاحب ایک مشفق باپ تھے۔ اپنی اولاد سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ والدہ صاحبہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ جن لوگوں نے ان کو متاثر کیا ان میں ہماری ممانی مرحومہ جمیلہ بیگم جو مہدی افادی کی بڑی بیٹی تھیں وہ سرفہرست ہیں۔ ان کے دوستوں میں فراق گورکھپوری، مولوی عبید الرحمٰن، جو ہمارے کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے قابل ذکر ہیں۔ میری ہر فرمائش وہ پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ میری تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کیا۔ بچپن میں انھوں نے مجھے فارسی پڑھائی۔ پھر بعد میں ان سے انگریزی بھی پڑھی۔ والد صاحب کے ایک شاگرد ملک زادہ منظور احمد تھے۔ جو میرے ساتھ بی۔ اے۔ میں ان کے طالب علم تھے۔ ان کی تحریر کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ اور کہتے تھے دیکھو اس کے لکھنے میں ایک اسٹائل ہے۔ ملک زادہ صاحب غالباً لکھنو میں ہیں۔ انھوں نے والد صاحب پر ایک مضمون لکھا تھا ''مجنو بحیثیت ایک انسان'' اسے والد صاحب نے بہت پسند کیا تھا۔

اردو کے ایک کلاس میں انھوں نے کہا کہ اقبال اشعار میں ایک بڑی خصوصیت جو ہے وہ اس کی موسیقیت اور اس کا آہنگ ہے۔ اقبال کا ہر شعر نازک سے نازک ساز پر گایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب ''شوپنہاور'' کی ایک جلد اقبال کو بھیجی تھی۔ اس کتاب کی علامہ نے بہت تعریف کی۔ اس بات کا وہ اکثر ذکر کرتے تھے۔ ایک دفعہ کلاس میں جگر مراد آبادی کو پڑھاتے ہوئے کہا کہ جگر کے اشعار میں ایک اچانک پن ہے۔ جس سے پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(مجنوں گورکھپوری کی شخصیت کی چند جھلکیاں۔ صفحہ 125 سے آگے)

پاکستان میں بھی ان کی بڑی قدر دانی ہوئی۔ سب نے ان کو سراہا۔ ان کے فکر وفن کا اعتراف کیا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں کسی سے کوئی گلہ نہ تھا۔ مجنوں صاحب سب سے زیادہ اپنے استاد ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے شاگرد بھی آج تک اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ مجنوں صاحب کے شاگرد ہیں اور ان سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔

مجھ سے اگر مجنوں صاحب کے بارے میں کوئی رائے مانگے، تو میں ان کی جامع تعریف اس طرح کروں: مجنوں صاحب علم کا سمندر، محبت کا رواں دھارا، عزم وحوصلہ کی مضبوط چٹان اور فکر وعمل کا پیکر تھے۔

مجنوں اور تصدیق جنوں / ڈاکٹر حنیف فوق

مجنوں گورکھپوری کا ایک شعر ہے کہ ۔

جستجو زندگی کا حاصل ہے اٹھ گیا جو قدم وہ منزل ہے

اس شعر میں کچھ ریاض خیر آبادی کے اس شعر سے کہ "رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے، جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے" مشابہت بھی ملتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ عصری فکر و آگہی کی جو جھلک پائی جاتی ہے وہ خود مجنوں کی ادبی شخصیت کی گواہی بھی دیتی ہے، اوران کے جنون ادب کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ مجنوں کے اٹھائے ہوئے قدم، ادب کی کئی منزلوں کے نشان ہیں اور وہ خود ہی آگے نہیں بڑھے، ان کے ہمراہ ادبی تصورات اور ادب کے دشت نوردوں کا ایک قافلہ بھی آگے بڑھا ہے۔

شاعری تو مجنوں گورکھپوری کے لئے ادب سے گرویدگی کی ایک صورت اظہار اور وسیلہ، ذوق رہی ہے لیکن افسانہ، ناولٹ، نیم افسانوی تحریریں، جنھیں نیم ادبی کہنا سوء ادب ہوگا، خودنوشت، فلسفیانہ تصنیفات اور پھر سب سے بڑھ کر تنقید جس میں نظریاتی اور عملی انتقادیات، دونوں شامل ہیں، ان کے ادب کی راہوں میں قائم کردہ سنگ میل ہیں جو نئی منزلوں کا پتا دیتے رہے ہیں۔ مجنوں کے وسیع مطالعہ کا اظہاران کے ادبی ترجموں سے بھی ہوا ہے۔ نثر ہو یا نظم دونوں کے ترجمے میں اصل کی روح کو اپنی گرفت میں لانا مشکل ہوتا ہے۔ اور کہیں لفظوں کی کتر بیونت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور کہیں مفہوم کے سیاق و سباق سے قطع نظر کرنا ہوتی ہے۔ چنانچہ مجنوں نے ہندی اور مغربی ادب سے بعض اہم تراجم کئے ہیں۔ لیکن اصل اور ترجمے کا فرق مثال کے طور پر مجنوں کے ناول "گردش" سے واضح ہوتا ہے۔ جو یوں تو ہارڈی کے ایک ناول سے ماخوذ ہے، لیکن جس میں ہارڈی کے ناول کی ایک خطہ، زمین سے وابستہ خصوصیات کے عدم اظہار نے اسے اصل سے الگ کردیا ہے۔ اور مجنوں کے اسلوب نثر نے اس پران کی شخصیت کی چھاپ لگا دی ہے۔ مجنوں نے مختلف میدانوں میں اپنے قلم کی روانی کے جوہر دکھائے ہیں لیکن اردو ادب کو مجنوں کی سب سے بڑی دین، ان کی تنقید ہے کہ اس میں ان کی شخصیت، مطالعہ، تجزیہ نگاری، تخیل کا ادبی اظہار، جائزہ لینے کی حیرت انگیز قوت، جمالیاتی نکتہ سنجی، اور دانش عصر کے مجموعی فکر سے امتزاج نے، ایسے چراغ روشن کئے ہیں، جن سے ہماری نگاہیں منور ہیں۔

نیاز، مجنوں اور فراق، تینوں نے ادب میں کچھ متوازی خطوط کھینچے تھے۔ تینوں میں کچھ باتیں مختلف تھیں لیکن جو باتیں مشترک تھیں، ان سے اس زمانے کے ادبی شعور نے بہت کچھ اخذ واکتساب کیا تھا۔ تینوں نے جدت خیال کو اہمیت دی تھی۔ البتہ نیاز جہاں شاعری میں بڑی حد تک لفظوں کے روایتی استعمال کے قائل تھے، وہاں نثر میں غیر معمولی لفظی تشکیلات اور غیر روایتی فکری میلانات کو پیش کرتے تھے۔ مجنوں نے روایت کے دائرے سے نکل کر سماجی صداقتوں کو قبول کیا تھا۔ فراق انھیں قبول کرنے کے باوجود، تاثرات پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے تھے۔ لیکن ان تینوں کی مشترکہ کاوشوں سے ادب میں لفظی اہتمام اور معنوی زیبائی کی طرف توجہ دینے کے رجحان کو فروغ ہو رہا تھا۔ اور ادب کا ہر طالب علم بقدرِ لب و دنداں ان کی تحریروں سے استفادہ کر رہا تھا۔

نیاز سے میری ملاقات تو لکھنو یونیورسٹی کے زمانہء طالب علمی میں ہوئی لیکن اس سے پہلے حلیم مسلم کالج، کانپور سے میرے بھیجے ہوئے کچھ مضامین نیاز کے نگار، لکھنو، میں اشاعت پذیر ہو چکے تھے۔ لکھنو یونیورسٹی میں مجنوں کی تحریریں پڑھتا اور ان کے بارے میں بہت کچھ سنتا رہا۔ لیکن ان سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہء اردو و فارسی سے بحیثیت استاد منسلک ہو چکا تھا۔ اور وہ مشرقی پاکستان آئے تھے۔ یہ ملاقات کئی ملاقاتوں پر مشتمل تھی۔ یعنی اس کا سلسلہ ان کے مشرقی پاکستان کے زمانہء قیام تک جاری رہا۔ وہ اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنے ریڈر نہ لئے جانے کے سبب ڈاکٹر شادانی سے شاکی تھے اور جب ڈھاکے کے ایک ہوٹل میں، میں نے چائے پر ڈاکٹر شادانی اور مجنوں گورکھپوری کو جمع کیا، تو یہ پھڑا پھوٹ بہا۔ لیکن اس کا اظہار ذاتی شکایت کے بجائے، اس طرح ہوا کہ مجنوں گورکھپوری نے نثر کی توصیف کرتے ہوئے شاعری کو ہدف ملامت بنایا، اگر چہ روئے سخن "شاعر" کی جانب تھا، ڈاکٹر شادانی خاموش رہے، تو مجھے ہی شاعری کا دفاع کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جس پر مجنوں گورکھپوری کا رمز آمیز یہ تھا کہ ایسی گفتگو جذباتی، رومانی شاعری سے زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ اظہر قادری اور اختر پیامی شریک صحبت تھے۔ اور مجنوں گورکھپوری کے فقروں کی داد دیتے ہوئے بھی، یہ حضرات، میری طرح ڈاکٹر شادانی کی محفل کو برہم نہ کرنے کی غرض سے خاموشی اختیار کر لینے کو ان کی بڑائی کا ایک پہلو سمجھ رہے تھے۔ ڈاکٹر شادانی کے خاموش رہنے سے، تھوڑی دیر بعد، فضا کا تکدر دور ہو گیا اور مزے مزے کی باتیں ہونے لگیں، مجنوں گورکھپوری پہلے بھی ڈھاکے آتے رہے تھے۔ اور اس قدیم او، کے ہوٹل کی چائے کے مداح تھے۔ اگر چہ اس میں وہ سرور نہ تھا جو "غبارِ خاطر" میں ابوالکلام آزاد کی چائے کا وصف کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نے پھر بھی دل کی گرہیں کھول دی تھیں۔

مجنوں گورکھپوری سے بعد کی ملاقاتوں میں بھی ان کی طبیعت کی تیز، براقی اور فقرہ تراشی کے اوصاف کا، جو ان کی ادبی شخصیت کے اہم عناصر تھے، علم ہوتا گیا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد، جب میرا تقرر شعبہء اردو کراچی یونیورسٹی میں کیا گیا، جہاں مجنوں گورکھپوری، اعزازی استاد کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے، تو مل بیٹھنے اور ادبی موضوعات پر گفتگو کرنے کے زیادہ مواقع ملے۔ ان سب ملاقاتوں سے مجنوں گورکھپوری کی ذہانت، علمیت دونوں کا نقش گہرا ہوتا گیا۔ میں ۱۹۷۳ء میں انقرہ یونیورسٹی چلا گیا وہاں سے جب بھی پاکستان آتا تو مجنوں گورکھپوری سے ضرور ملتا۔ اور مستقل واپسی کے بعد ان سے ملاقات کی زیادہ صورتیں نکلتی رہیں۔ جب مجنوں صاحب نے ارمغان مجنوں کی جلد دوم ''دیرینہ مراسم کی یاد میں، ڈاکٹر حنیف فوق کے نام 'مجنوں گورکھپوری، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۴ء'' لکھ کر عنایت کی تو میں نے اسے ان کی ایسی شفقت و محبت سمجھا 'جو میرے لئے ہمیشہ باعثِ فخر و اعزاز رہے گی۔

ڈاکٹر امرناتھ جھا نے مجنوں اور فراق دونوں کو جملہ ساز کہا تھا۔ اور یہ خراج تحسین دراصل دودھاری تلوار کے مانند تھا۔ جس میں گہرے، مسلسل اور مربوط فکر سے زیادہ 'ان دونوں کی بات بنانے اور عبارت آرائی پر توجہ کا بیان 'مقصود تھا۔ لیکن یہ بیان، مجنوں اور فراق دونوں کے طرز ادا کی جاذبیت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی 'ان کے وسیع مطالعہ اور فطانت کا صحیح اظہار نہیں۔ مجنوں اور فراق دونوں دور جدید سے متاثر ہوئے تھے۔ لیکن دونوں کے تہذیبی تصورات کے فرق نے ایک کو احساس کی لطافت کی جانب اور دوسرے کو فکری صداقتوں کی طرف زیادہ مائل کر دیا تھا۔ لیکن دونوں کی قائم شدہ ادبی روایات سے دلبستگی دور حاضر کے لئے ایک زندہ حوالے کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ فراق نے مصحفی پر اور مجنوں نے فانی پر جو تنقیدی مضامین لکھے وہ بصیرت کا انکشاف ہیں۔ اسی ادبی بصیرت کی جھلک مجنوں کے عملی تنقید سے تعلق رکھنے والے بعض دیگر مضامین میں ملتی ہے۔ یہی نہیں اپنے نیم افسانوی مضامین میں بھی 'مجنوں نے جب کسی قدیم شاعر کا کوئی شعر پیش کیا ہے تو گویا اس کو نئی زندگی کی چمک دے دی ہے۔ اس طرح کہ خود اس شاعر کے مطالعہ کے دوران اس شعر سے سرسری گزر جانے والی نظریں بھی 'اس کے ادبی حسن کو پالینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ یہ منطقی فکر و احساس 'مجنوں کی تنقید کا نمایاں وصف ہیں۔

زندگی اور اس کی تخلیقات کو تاریخ اور عمرانیات کی روشنی میں دیکھنے کے تصور اور حدوث ارتقا کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں مجنوں گورکھپوری نے ترقی پسند تحریک کو اپنے لئے ایک اتفاقی بات قرار دیتے ہوئے خود کو ہمیشہ سے ان ''حقائق'' ماننے والا بتایا ہے۔ لیکن خود مجنوں ہی نے لکھا ہے کہ ''جدید تنقید نگاری میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مضمون 'ادب اور زندگی 'سنگ بنیاد کا حکم رکھتا ہے۔'' دراصل مجنوں نے ایک

طویل ذہنی سفر طے کیا ہے اور ''جن'' اور ''جان'' (رسالہ ''جن'' کے مدیر کے لئے تجویز کردہ نام) کے چکر سے نکل کر ادب اور زندگی کی وسعتوں تک پہنچنے میں ان کی رہنمائی اس تحریک کے پیش رووں کی تحریروں سے ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پھر مجنوں نے اردو تنقید کو اپنے گہرے ادبی تعلق اور مطالعہ کا فائدہ پہنچا کر نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مجنوں کی ذاتی ادعائیت اور مزاج کی مناظرانہ کیفیت کو متوازن کرنے میں خود اس تحریک سے ان کی وابستگی نے بڑا کام کیا ہے۔ اس کا اہم ثبوت خود احتسابی ہے۔ مجنوں جیسی بڑی ادبی شخصیت کا اپنی چند قلمی لغزشوں برملا اعتراف' جہاں خود ان کے کردار کی عظمت کی دلیل ہے' وہاں اس تحریک کے پیدا کردہ اس انسانی شعور کا اظہار بھی ہے جس نے اصرار خود نمائی کی جگہ انکسار ذات کے رجحان کو فروغ دیا تھا۔ اسی تحریک کے اثر سے مجنوں انسان کی انفرادیت کے قائل ہوتے ہوئے بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''اب ہمارے ادب کا اسلوب جمہوری اور غیر انفرادی ہو رہا ہے۔''

مجنوں گورکھپوری ان شخصیتوں میں ہیں' جن سے ادب کا وقار قائم ہوتا ہے۔ اپنی بعض متضاد رائیوں اور کچھ حیران کن جملوں کے باوجود' ان کی تحریروں نے ادبی شعور کو کئی سمتوں میں آگے بڑھایا ہے۔ خاص طور پر اردو تنقید میں شگفتگیٔ بیان اور عقلی استدلال کو مربوط کرنے اور خیال حسن کا حسن عمل کے ساتھ رشتہ جوڑنے میں مجنوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ مجنوں نے ادب القدماء کی اہمیت بھی بجھائی ہے اور ادب میں روح عصر کی ضرورت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے لئے آج بھی ان کے کئی مضامین نہایت معتبر حوالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجنوں نے اپنے اتفاق اور اختلاف دونوں سے اردو ادب میں بحث و نظر کے نئے دروازے کھولے ہیں۔ مجنوں کا کام اتنا وقیع اور ان کا نام ایسا عزیز تھا کہ صرف ان کی موجودگی ہی ہمارے لئے ذہنی تحریک کا باعث تھی۔ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں' لیکن ان کی بخشی ہوئی روشنی ہمارے ذہنی گرد و پیش پر محیط ہے۔

مجنوں گورکھپوری / افسر ماہ پوری

مجنوں گورکھپوری کی ذات، صفات اور ادبی خدمات کسی تعارف اور تعریف کی محتاج نہیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن اور اپنے کارناموں سے ایک عہد ہیں۔ اور ان کی سی ہمہ گیر، ہمہ داں اور ہمہ جہت شخصیت گلستان شعروادب میں نرگس کے ہزاروں سال رونے کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت مجنوں صاحب کی عمر تقریباً اسی (۸۰) سال ہے۔ جس کے لگ بھگ ساٹھ سال (۶۰) سال اردو شعروادب کے تمول وترفع کے ضمن میں جس تسلسل، تحمل اور توکل کے ساتھ انھوں نے صرف کیے ہیں اُسے عبادت سے تعبیر کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ہر چند کہولت وعلالت کے باعث قلم سے ان کا سابقہ رشتہ قائم نہیں رہا ہے پھر بھی ان کا تخلیقی تحرک وتموج ہنوز جوان وتوانا ہے۔ جس کی بہترین مثال ان کے وہ پر مغز اور خیال افروز خطوط ہیں جنھیں انھوں نے اپنے فرضی کردار ''نیلم'' اور ''دلآرام'' کو حال ہی میں لکھے اور جو ''ارمغان مجنوں'' (جلد اول) میں شامل ہیں۔ یہ خطوط اسلوبِ نگارش کی دلکشی اور فکر ونظر کی گہرائی کے اعتبار سے اردو ''فن مکتوب نگاری'' میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

مجنوں صاحب کا حافظہ بے انتہا قوی اور ان کا مطالعہ بے پناہ وسیع ہے۔ اتنا وسیع کہ مشرقی ومغربی علوم کے کم وبیش تمام شعبے اس میں سمٹ آئے ہیں۔ ساتھ ہی وہ انگریزی کے استاد اور اردو کے فنکار ہونے کی حیثیت سے مشرق ومغرب کی ساری ادبی تحریکات ورجحانات پر ماہرانہ نظر اور دانشورانہ قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت وفن کے تین گوشے سب سے زیادہ ممتاز ونمایاں ہیں۔۔۔ تخلیق، تنقید اور تحقیق۔۔۔ اور ہر گوشہ اپنی انفرادی وامتیازی شان وشوکت رکھتا ہے۔ مگر جو مقام ومرتبہ انھیں تنقید میں حاصل ہوا وہ کسی اور شعبے میں نہ ہوسکا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ موجودہ دور میں اردو کے سب سے بڑے نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔

مجنوں صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ وہ نہ تو کبھی قدیم سے متنفر ہوئے اور نہ کبھی جدید سے متوحش رہے۔ اگرچہ ان کی ادبی نشو ونما اس رومانی دور میں ہوئی جب مہدی افادی، نیاز فتحپوری، ابوالکلام آزاد اور ٹیگور کے رشحات قلم کے افسوں کا شعروادب پر چھایا ہوا تھا مگر انھوں نے حیات وکائنات اور شعروادب کے مسائل کا مطالعہ وتجزیہ اس فضا سے ہٹ کر کیا۔ یہیں سے ان کی فنی توازن اور فکری سلامت روی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ چنانچہ اردو ادب کے تیزی سے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر وہ شاعری سے افسانہ نگاری اور افسانہ نگاری سے تنقید نگاری تک پہنچے اور یہی

ان کی آخری منزل قرار پائی، جہاں ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ لیکن ان کے اس ادبی سفر میں سب سے سخت اور صبر آزما مرحلہ اس وقت پیش آیا جب ایک طرف روس میں اشتراکی انقلاب کے زیر اثر نئی نسل کے بعض فنکار اردو ادب کو سیاسی نعرہ بنانے پر تلے ہوئے تھے اور دوسری طرف پرانے لکھنے والے اپنی قدامت پرستی پر مصر تھے اور کسی تجربے یا تبدیلی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد یہ ادبی کشمکش اور شدید ہوگئی اور اردو ادب کئی خانوں میں بٹ گیا۔ مجنوں صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ان دو انتہا پسندیوں میں نقطۂ اتصال و اعتدال پیدا کیا اور اردو ادب کو قدیم و جدید ادب کی بہترین روایتوں اور قدروں پر استوار کیا۔ انھوں نے شعر و ادب کی پرکھ کا جو پیمانہ مرتب کیا' وہی آج بھی سب سے زیادہ محکم و معتبر ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مجنوں صاحب کی تنقید قدیم و جدید میں ایک منصفانہ سمجھوتہ' ایک خوشگوار ملاپ اور ایک صحت مندانہ اتحاد ہے' جس سے اردو شعر و ادب کو صحیح اور واضح خطوط پر آگے بڑھنے میں مدد ملی اور ان کی تنقید کی یہی سب سے بڑی پہچان اور یہی ان کی سب سے بڑی خدمت اور کارنامہ ہے' جس پر اردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

(یہ مضمون اس وقت لکھا گیا تھا جب مجنوں صاحب حیات تھے۔)

مجنوں گورکھپوری صاحب/مظہر جمیل

آج ہم جس نابغۂ روزگار شخصیت کا جشن صد سالہ منا رہے ہیں وہ جدید اردو ادب میں کئی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت اور انفرادیت کی حامل ہے۔ مجنوں گورکھپوری ۱۰ رمئی ۱۹۰۴ء کو ضلع گورکھپور کے موضع ''بستی'' (بلڈہ) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد گرامی محترم محمد دیوانہ علی گڑھ یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ چنانچہ تدریس کا آبائی پیشہ مجنوں صاحب نے بھی اپنایا۔ پہلے پہل سینٹ اینڈریوز کالج کے شعبہء انگریزی سے منسلک رہے۔ بعد میں گورکھپور یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہء اردو کی صدارت کی (۱۹۵۸ـ۱۹۶۸)۔

۱۹۶۸ میں کراچی آجانے کے بعد کم و بیش دس سال تک جامعہ کراچی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

مجنوں گورکھپوری اپنے عہد کے نہایت ذہین، خلاق اور وسیع المطالعہ شخص تھے۔ فلسفہ، ادبیات عالم، نفسیات، جمالیات، سیاسیات اور معاشیات ان کے خاص شعبے تھے جن سے دلچسپی کا اظہار ان کی تحریروں میں بھی ہوتا رہا ہے۔ ان کے معاصرین میں ایسی ایسی باکمال، بے مثال اور بلند قامت شخصیتیں شامل تھیں جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ آفتاب کی طرح روشن تھی۔ اور ذہانت و فطانت سے چکا چوند ماحول میں اپنی جداگانہ شناخت قائم کرنا اور اپنی علیحدہ فکری پہچان بنانا غیر معمولی صلاحیت اور استعداد کے بغیر ممکن نہ تھا

مجنوں صاحب جدید اردو ادب کی دو اہم نثری اصناف کے بنیاد گزار ہیں۔ اور اکثر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ انھیں تنقید کے حوالے سے اہمیت دی جائے یا افسانے کے تشکیلی دور کے معماروں میں شمار کیا جائے۔ کیوں کہ ہر دو اصنافِ ادب میں ان کی گراں مایہ تخلیقات مقدار اور معیار ہر دو اعتبار سے اکثر معاصرین سے سوا تھیں۔ وہ افسانہ نگاری اور نقد و نظر دونوں شعبہ ہائے ادب میں اختصاصی اور اجتہادی مقام کے حامل رہے ہیں۔

ان کا پہلا طویل مختصر افسانہ ''زیدی کا حشر'' ۱۹۲۵ء میں علامہ نیاز فتح پوری کے جریدے ''نگار'' میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ (مئی، جون، جولائی) جس کا غیر معمولی خیر مقدم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد

دس گیارہ مجموعے پے بہ پے دس پندرہ برسوں میں شائع ہوئے تھے۔ طبعزاد تخلیقات میں ایک ناولٹ اور چند ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ آسکر وائلڈ، برنارڈ شا، ٹالسٹائی، شوپنہار، بائرن، ملٹن اور ہارڈی کے منتخب تحریروں کے تراجم ہیں۔ لیکن جو چیزیں کسی انتخاب اور مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکی ہیں اور رسائل و جرائد کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں ان کی مقدار بھی بہت زیادہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کے تحقیقی ادارے کے تحت اس نوع کی تحریروں کی کم از کم فہرست سازی ضرور کر لی جائے۔

تیسری صدی کی دوسری دہائی میں لکھنے والوں کا ایک ایسا دور سامنے آ گیا تھا جو اپنے مخصوص تخلیقی رویے اور اسلوب نگارش کی بنا پر جداگانہ شناخت رکھتا تھا۔ اور بالعموم ایک ساتھ بریکٹ کیا جاتا تھا۔ کوئی انھیں رومانی افسانہ نگار کہتا اور کوئی ان کی تخلیقات کو نفسیاتی افسانے کے خانے میں رکھتا۔ بہر حال یہ لوگ واضح طور پر اس مین اسٹریم سے مختلف انداز نگارش رکھتے تھے جو راشد الخیری، پریم چند، سدرشن، سلطان حیدر جوش، اختر حسین رائے پوری، اختر اورینوی، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور احمد علی وغیرہم کے توسط سے برگ و بار لا رہا تھا۔ بعض ناقدین اول الذکر تخلیقات کو متوازی افسانے سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

مجنوں صاحب نے اس دور اور رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے افسانوی مجموعے ''سمن پوش'' کے دیباچے میں لکھا ہے: ''۱۹۲۰ء کے بعد اردو افسانے میں ادب لطیف کا زور تھا۔ ناول اور افسانے میں یا تو اصلاحی میلان تھا جس کی تنہا نمائندگی پریم چند کر رہے تھے۔ یا وہی رومانی میلان تھا جو ادب لطیف کی روح و رواں تھا۔ جس کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کرتے تھے۔ میرے ناولٹ اور افسانے اسی سلسلے کی آخری کڑی تھے۔''

یہاں اپنے انداز نگارش کو رومانی دور کی آخری کڑی کہہ کر اس بات کی طرف بہت بلیغ اشارہ کیا ہے کہ کوئی وقت جاتا ہے کہ رومانی افسانہ حقیقت پسندیدیت کے لئے راہ ہموار کرنے کو ہے۔ ''سمن پوش'' ہی کے دیباچے میں انھوں نے اس بات کی صراحت کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ: ''میرے خیال میں افسانے کی غائت وہی ہے جو تمام فنون لطیفہ کی ہوتی ہے۔ یعنی حقیقت کو مجاز کے پردے میں اس طرح پیش کرنا کہ دنیا اس حقیقت کو پا سکنے کی متحمل ہو سکے۔''

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مجنوں صاحب کے افسانے علامہ نیاز فتح پوری کے افسانوں کی طرح نہ تو خالص تخیلاتی تھے اور نہ ان میں محض انشائے لطیف اور ٹیگوریت کی وہ شربت تھی جو اس عہد کی شناخت تھی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو ان کے افسانوں میں حقیقت اور التباسِ حقیقت کا یک گوناں تاثر ضرور موجود تھا۔ اور ان میں زندگی کی تلخ کامیوں کا ذائقہ بھی تھا۔ سبط حسن صاحب نے مجنوں گورکھپوری کے

افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے: ''ان کے افسانوں میں پوربی یوپی کا دیہاتی سانس لیتا ہے۔اور چونکہ میرا تعلق یوپی کے پورب سے ہے اور میں دیہاتی بھی ہوں مجھے مجنوں صاحب کے افسانوں میں اپنے دیس، گاؤں اور گھر کی کہانی نظر آتی ہے۔''

بے شک محبت ان کے افسانوں کا خاص موضوع رہی ہے۔لیکن وہ نشاط محبت کے مصور ہر گز نہ تھے۔ بلکہ محبت کی المناکیوں کے نوحہ گر تھے۔ کیونکہ وہ محبت کو زندگی کی تلخ ترحقیقت سے عبارت سمجھتے تھے جس کا ماحصل گھٹن اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں۔اس صورت حال کی توضیح پروفیسر احتشام حسین نے خوب کی ہے۔وہ لکھتے ہیں: ''محبت میں وغم اور تلخی ہے، گھٹن اور ناکامی ہے وہ ان کا بنیادی موضوع ہے، ان کے افسانے کسی طرح بھی آج کی فضا اور مسائل سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے لیکن اس وقت کسی نہ کسی حد تک یہ صورت ضرور تھی کہ گھروں کے اندر لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، خون تھوکتے تھے اور دق کا شکار ہو کر سسک سسک کر مر جاتے تھے۔اور ان کو اس کے سوائے کوئی اور راستہ دکھائی ہی نہ دیتا تھا کہ وہ اپنے غم کو دلوں میں چھپائے دنیا سے گزر جائیں۔''

''سمن پوش'' مجنوں گورکھپوری کے نفسیاتی افسانوں میں سب سے نمائندہ افسانہ ہے۔اور اب سے اسی (۸۰) سال قبل انھوں نے جرم سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیوں کو جس تخلیقی انداز اور ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا تھا وہ کچھ انہی کا حصہ تھا کہ اس وقت نفسیات کے علم کا ادب میں اس طرح کی پیشکش عام نہ ہوئی تھی۔اور بہت سی باتوں پر اوہام زدگی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔

مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری پر گفتگو ختم کرنے سے قبل میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف بھی دلانا چاہتا ہوں کہ اردو افسانے کے فنی رموز، مبادیات اور اصول وضوابط کی تشکیل کے باب میں بھی جن لوگوں نے سنجیدگی سے غور وفکر کیا تھا ان میں مجنوں صاحب کا نام بھی شامل ہے۔اس سلسلے میں ان کی کتاب ''افسانہ اور اس کی غائت'' جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی اب بھی ایک حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔اس سے قبل عبدالقادر سروری کی کتاب ''دنیائے افسانہ'' ۱۹۲۷ء میں شائع ہو چکی تھی جس میں انھوں نے افسانہ نگاری کی بابت بعض ضروری نکات اٹھائے تھے لیکن وہ اس بحث کو بہ وجوہ سمیٹ نہ سکے تھے۔اس سلسلے میں دو تین مضامین ل احمد اکبر آبادی کے بھی مل جاتے ہیں۔لیکن جس استدلال اور خوبی کے ساتھ اس مسئلے کو مجنوں صاحب نے نبھایا ہے، اس کی مثال ماقبل تحریروں میں نہیں ملتی اور اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ مغربی زبانوں کے ادب کا بالاستیعاب مطالعہ رکھتے تھے۔اور وہاں فکشن سے متعلق ہونے والے جملہ مباحث ان کی نگاہ میں تھے۔پھر ایک تخلیقی فنکار ہونے کی نسبت سے بھی وہ اس حقیقت

سے آگاہ تھے کہ کسی بھی تخلیقی عمل کو محض ضابطوں میں نہیں جکڑا جا سکتا اور جدت آشنا مزاج ہر پابندی کو توڑ کر نئی راہیں نکالنے پر قادر ہوا کرتا ہے اور تخلیقی عمل میں اپنی خود مختاری کا جواز رکھتا ہے۔لیکن اس کے باوجود وہ ادبی روایت میں موجود شہکار تخلیقات کو سامنے رکھ کر چند بنیادی ضابطے اخذ کر لینے کو ضروری سمجھتے تھے۔اس سلسلے میں وہ افسانے میں مرکزی نقطۂ نظر، ارتکاز خیال، ارتکاز فکر و عمل کو فنی لوازمات میں شامل سمجھتے تھے۔کیوں کہ ان ہی سے پلاٹ، کردار، ماحول اور وہ جمالیاتی تاثر پیدا ہوتا ہے جسے افسانے کی غائتِ اولیٰ سمجھنا چاہیے۔یہاں ان کا تنقیدی شعور ایک میانہ روی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔اور وہ خود کو روسی ہئیت پسندوں Formalists کے اثرات سے بچالے جاتے ہیں۔جبکہ نیاز فتح پوری اس باب میں کم و بیش ان ہی خیالات کی کی ترویج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔جو ہئیت پرستوں (فارملسٹوں) نے اختیار کیا تھا۔

مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری نسبتاً زیادہ وسیع اور زیادہ گہرا موضوع ہے۔جس پر یہاں تفصیلی گفتگو ممکن نہیں۔صرف اشارتاً اتنی بات عرض کی جاسکتی ہے کہ اس دور کے تنقیدی رویوں میں مجنوں صاحب ایک اجتہادی رویے پر کاربند دکھائی دیتے ہیں۔کیوں کہ وہ ایک طرف تنقید کو تاثراتی طریق تنقید کے بند کوچے سے نکال رہے تھے تو دوسری طرف جمالیاتی اصول و ضوابط کا خاکہ ترتیب دے رہے تھے۔تنقیدی نظریہ سازی میں عینیت پسندی کی بجائے ارضی معروضیت سے رشتہ و پیوند کرنا ایک مشکل مگر صحیح طریق کار تھا۔جس کے لئے یونانی فلاسفہ کے اصولوں کی نئی توجیہہ پیش کرنے کی ضرورت تھی۔بے شک حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ خیال پر مادے کی فوقیت ثابت کر دکھائی تھی اور ادب میں افادیت اور حسن و خیر کے تصور کو نقد و نظر کی اساس بنا دیا تھا، لیکن سرسید اسکول سے متعلق ناقدین جن میں حالی، شبلی اور آزاد بھی شامل ہیں تھے کے یہاں قومی مقصدیت کی تیز لے کے خلاف ردِ عمل کی صورت بھی موجود تھی۔اسی طرح ترقی پسند ناقدین کو ادب کے سماجی اور سیاسی کردار پر اصرار تھا۔اس صورت حال میں مجنوں صاحب نے ایک ایسے نظریہ ساز کا کردار ادا کیا ہے جس نے نئی جمالیاتی اقدار کی توجیہات پیش کیں اور ترقی پسند تنقید کو زیادہ وسیع اور بامعنی بنیادیں فراہم کیں۔

لیلیٰ اردو کا شیدا تھا جو مجنوں مر گیا / پروفیسر افتخار اجمل شاہین

گورکھپور کی سرزمین سے دو عظیم شخصیتوں کو نسبت رہی ہے۔ایک فراق گورکھپوری اور دوسرے مجنوں گورکھپوری۔فراق کے گزرنے کے بعد مجنوں گورکھپوری اکیلے رہ گئے تھے۔اس سلسلے میں نصر اللہ خان نے اپنے انداز میں بڑی اچھی بات کہی ہے۔

"گورکھپور بھی عجیب خطہ ہے۔یہاں جو بھی پیدا ہوا باون گز کا۔مجنوں صاحب کے والد گرامی دیوانہ گورکھپوری کا قد وقامت تو اس سے دو چار انگل نکلتا ہوا تھا۔ان میں صرف دو باون گزوں کا نام ہم نے سنا ہے۔ ایک تو فراق ہیں اور دوسرے مجنوں۔فراق ہندوستان میں رہ گئے۔مجنوں پاکستان چلے آئے۔اور یوں گورکھپوریوں کی تقسیم عمل میں آئی۔"

احمد صدیق مجنوں گورکھپوری مئی ۱۹۶۸ میں پاکستان آ گئے تھے۔۱۹۶۸ سے ۱۹۷۸ تک جامعہ کراچی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔شمالی ناظم آباد سے کراچی یونیورسٹی کا فاصلہ بہت زیادہ ہے۔مگر وہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود جامعہ جاتے رہے۔اس لئے کہ وہ اگلے وقتوں کے لوگوں اور اگلے وقتوں کے استادوں میں تھے جو اپنے شاگردوں کو شوق اور لگن سے پڑھایا کرتے تھے۔

مجنوں صاحب کے اندر بس ایک ہی جذبہ تھا کہ وہ نئی نسل کو کچھ دے سکیں۔جب جامعہ جانے کا سلسلہ بند ہو گیا تو ان کا مکان ہی مرجعِ خاص وعام ہو گیا۔تشنگان علم وادب اب ان کے گھر پر حاضری دینے لگے۔ان میں وہ بھی تھے جو ادیب، مصنف اور شاعر تھے۔ان کا وجود کراچی میں اس حیثیت سے بہت غنیمت تھا کہ زبان وادب سے متعلق اگر کوئی مسئلہ آ جاتا یا لفظ کے استعمال یا اس کی صحت پر کوئی شبہ پیدا ہو جاتا تو مجنوں صاحب سے لوگ اس سلسلے میں رجوع کرتے۔اور زیر بحث مسئلے سے متعلق مجنوں صاحب کی جو رائے ہوتی، اسی کو صائب اور مستند تسلیم کیا جاتا۔چونکہ مجنوں صاحب علم وادب کے اس منصب پر فائز تھے کہ ان کا زبان وادب کے کسی مسئلے پر کچھ کہنا محاکمے کا درجہ رکھتا تھا۔یہ ادبی منصب و مرتبہ انہیں ان کی زندگی بھر کی علمی وادبی ریاضت سے حاصل ہوا تھا۔بقول ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (عظیم آبادی):

''خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو عمر طبعی پر پہنچ کر وثوق سے کہہ سکیں کہ

''کارے کردم'' اگر مجنوں صاحب یہ دعویٰ کریں تو وہ حق بجانب ہیں۔''

مجنوں گورکھپوری صاحب کی ساری زندگی پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں گزری۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مجنوں صاحب کی ادبی شخصیت کے کئی رخ تھے۔ وہ افسانہ نگار، بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کی تصانیف میں فلسفہ بھی شامل ہے اور ادبی تنقید بھی۔ وہ ایک مستند و ماہر مترجم بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے انگریزی کی آٹھ مستند کتابوں کا کامیاب ترجمہ بھی کیا تھا۔ دو کتابیں ''زہر عشق'' اور ''حسن فطرت'' ان کی تالیفات میں شامل ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے مجنوں گورکھپوری صاحب کا قد بلند و بالا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جب کہ تنقید اور تخلیق سے متعلق ان کا یہ کہنا تھا:

''کوئی شخص شاعری پر صحیح نہیں کر سکتا جو خود فن شاعری میں پورا ادراک اور
اس کے اصولوں اور اسالیب سے پوری طرح آگاہی نہ رکھتا ہو۔ شاعر بھی
اس وقت تک بڑا نہیں شاعر نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اندر نہایت
کھری اور کارگر قسم کی تنقیدی صلاحیت موجود نہ ہو۔''

ان کی سماجی، تہذیبی، علمی، ادبی اور تدریسی سرگرمی، لگن اور خدمات کو دیکھتے ہوئے یہ بات بلا کسی شک وشبہ کے کہی جاسکتی ہے کہ مجنوں گورکھپوری نے ایک بھرپور اور قابل رشک زندی بسر کی ہے۔ تقریباً چھ (٦) دہائیوں تک ایک تسلسل کے ساتھ اردو زبان و ادب کی گراں مایہ خدمت انجام دی۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کے پیش نظر یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ مجنوں صاحب فیض وکمال کا دریا تھے جس سے بے شمار تشنگان علم وادب نے اپنی پیاس بجھائی۔ ان کی ذات ایک انجمن سے کم نہ تھی۔ ان کے کارنامے تاریخ ادب اردو میں جلی حروف سے لکھا جائے گا۔ زندگی کی ۸۴ بہاریں دیکھنے کے بعد اردو کا یہ شیدا اس جہان آب وگل رخصت ہوا۔ میر نے شاید ایسے ہی لوگوں کی موت کے لئے یہ شعر کہا تھا۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ کیا دوانے نے موت پائی ہے

اور سیماب اکبرآبادی کے الفاظ میں، ہم اس حقیقت کا اعترف اس طرح کر سکتے ہیں۔

انسان کا کوئی کام باقی رہ جائے مرنے پر بھی فیض عام جاری رہ جائے
زندہ ہے فنا کے بعد بھی وہ سیمابؔ جس کا دنیا میں نام باقی رہ جائے

(یہ مضمون اس وقت لکھا گیا تھا جب مجنوں صاحب نے وفات پائی تھی۔)

مجنوں گورکھپوری مشاہیر کی نظر میں

فراق گورکھپوری

مجنوں کے کچھ تنقیدی فقروں کی نوک پلک دیکھئے۔ مثلاً ''غالب بڑا پاجی شاعر ہے''، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اس کی تقلید کی وہ خراب ہو کر رہ گیا۔ ''غزل ایک بہت کٹر صنف سخن ہے۔'' کٹر کا لفظ دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ ''حالی ماتھے پر بل ڈالے بغیر سلامت روی سے اپنی نثر لکھتے چلے جاتے ہیں۔'' کس خوبی سے حالی کے مزاج نثر نگاری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک بار میں شبلی کے مقابلے میں محمد حسین آزاد کی نثر نگاری کی حمایت کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بحث جاری رہنے کے بعد مجنوں نے کہا ''آزاد نے لکھا ہی کیا ہے؟'' کس خود اعتمادی سے مجنوں نے اپنی بات کہی۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو عمر طبعی پر پہنچ کر وثوق سے کہہ سکیں کہ ''کارے کردم'' اگر مجنوں صاحب یہ دعویٰ کریں تو وہ حق بجانب ہیں۔ پچاس سال کی طویل مدت تک درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے وسیلے سے ادب آموزی کرنا بذاتِ خود ایک کارنامہ ہے۔ کارنامہ ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے۔ یوں جدید ادب کی رہنمائی میں جن نقادوں نے اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں مجنوں صاحب کی حیثیت بہت ممتاز اور نمایاں ہے۔

احمد ندیم قاسمی

محترم مجنوں گورکھپوری کی تنقیدی بصیرت سے، ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والے بھی انکار کی جراءت نہیں کر سکتے۔ رسمی اور سطحی تنقید سے بوجھل ادبی فضا میں مجنوں گورکھپوری کی تنقید کی مثال، تازہ ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی ہے۔ جس نے مروجہ تنقیدی معیاروں اور قدروں کو صحت مند انداز میں منقلب کر دیا اور اس تنقید کی ابتدا ہوئی جو نہ سراسر تحسینی ہوتی ہے اور نہ سراسر مخالفانہ، بلکہ جو تجرباتی اور اثباتی تنقید ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے اردو نقادوں کے سامنے جراءتِ اظہار کی بے شمار بلیغ مثالیں پیش کیں اور بعض ان نکات کو بھی، جنھیں ہمارے نقاد مسلمات میں شامل کر چکے تھے، اپنے قلم کی نوک سے کریدا اور انھیں حقیقت کی دھوپ دکھائی۔ حق بات یہ ہے کہ وہ اردو تنقید کے جزو اکبر ہیں۔

سید سبط حسن

تاریخ گواہ ہے کہ مجنوں صاحب نے اپنے ترقی پسندانہ مسلک سے کبھی انحراف نہیں کیا اور نہ اپنے فلسفہء زیست کو کبھی مصلحتوں کے قالب میں ڈھالا۔ وہ پہلے بھی ترقی پسند تھے اور آج بھی ترقی پسند ہیں' کہ ترقی پسندی ان کی سرشت بھی ہے اور ان کا ضمیر بھی ہر چند کہ پچھلے پچاس برسوں میں دنیا میں بے شمار تبدیلیاں آئی ہیں' خود ترقی پسند ادب کی تحریک بہت سے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ مجنوں صاحب کے بعض ہمسفروں اور ہم صفیروں نے پٹری بھی بدل لی ہے یا تھک کر بیٹھ رہے ہیں مگر یہ پیر جواں فکر آج بھی اپنے قلم کی پاک دامانی کا پرچم لہرا رہا ہے۔ وہ قلم جس نے ہماری کئی نسلوں کو ادب کا پاکیزہ شعور عطا کیا' وہ قلم جو حسن صداقت کی علامت بھی ہے اور مردان حق پرست کے لئے مشعل راہ بھی۔ یہ قلم صدا سلامت رہے اور مجنوں صاحب کی نازک انگلیاں اس کے بوجھ سے کبھی نہ تھکیں۔

کلیم الدین احمد

صحیح معنوں میں نقاد وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے دماغ میں ہزاروں دماغوں کی صلاحیتیں یکجا ہوں' مجنوں گورکھپوری پر یہ خیال صادق آتا ہے۔ ان کے دماغ میں ایک بڑے نقاد، ایک بڑے افسانہ نگار ،ایک بڑے شاعر اور ادیب کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

مجنوں صاحب کئی سمتوں اور زمانوں کے آدمی تھے۔ وہ رومانیت سے حقیقت تک پہنچے۔ ان کا مضمون ''ادب اور زندگی'' ترقی پسند تحریک کے طائران پیش رس میں شمار کیا جاتا ہے۔ اقبال اور پریم چند کے بعد مجنوں، اختر حسین رائے پوری اور احمد علی کی تحریروں نے ترقی پسند تحریک کے لئے فضا ہموار کی۔ یہ لوگ محض اس تحریک کی پیداوار نہیں تھے۔ مجنوں صاحب نے ہمیں بتایا کہ ادب کسی خلا میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ کسی ''خاص نظام تمدن کا پروردہ'' ہوتا ہے۔ وہ ادیب کی انفرادی اپج کو بھی ''ہئیت اجتماعی'' کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ مگر مجنوں صاحب نے اس راستے پر اس سہل انگاری کے ساتھ سفر نہیں کیا جو بہت سے ترقی پسندوں کا رویہ بن چکی تھی کہ ادب بس ماحول کا نقش ہے اور اس کے آگے کچھ نہیں۔ مجنوں صاحب ادب کی الہامی زبان کے بھی ہمیشہ قائل رہے ہیں۔ زمان و مکان اور ادب کے رشتے کو جاننے کے ساتھ ساتھ وہ ادب کی لازمانیت کے قائل بھی نظر آتے ہیں۔ جس دور میں بیشتر نقاد ادب کو زمانے کے احوال کی

کاربن کاپی قرار دے رہے تھے، مجنوں صاحب نے کہا: ''ادیب یا شاعر زمان و مکان سے بغاوت نہیں کرسکتا اگرچہ وہ ان چیزوں کا غلام بھی نہیں ہے۔''

ڈاکٹر عبدالسلام

مجنوں انفرادیت کی اہمیت کے بھی قائل ہیں اور روسی نقطۂ نظر سے انحراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''موضوع اور مواد معاشرتی میلانات سے ملتے ہیں۔ صورت اور اسلوب کو ادیب کی انفرادیت مہیا کرتی ہے.......... جب تک انسان انسان ہے اس وقت تک اس کے اندر انفرادیت باقی رہے گی اور کوئی اشتراکی یا انقلابی دستور العمل اس کو ایک دم فنا نہیں کرسکتا۔''

مجنوں گورکھپوری نے اپنی اولین کتاب ہی میں ادب کے بعض بنیادی مسائل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا اس عہد کے نقادوں اور ادب کے باشعور قارئین پر کافی اثر پڑا ہے۔

اس میدان میں انھوں نے اس عہد کے تمام بڑے نقادوں مثلاً کلیم الدین احمد، آل احمد سرور اور احتشام حسین سے پہلے قدم رکھا۔ کلیم الدین احمد اردو کے نقادوں کے زیادہ قائل نہیں ہیں، مگر مجنوں کی علمیت کے وہ بھی قائل ہیں۔ لکھتے ہیں: ''مجنوں کا مطالعہ وسیع ہے۔ شاید ہی علوم کا کوئی شعبہ ہو جس کے متعلق وہ کافی معلومات نہ رکھتے ہوں۔''

یورپی ادب کے بارے میں ان کا مطالعہ تقریباً اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ کلیم الدین کا۔ یوں تو انھوں نے اردو بھی پڑھائی ہے، مگر وہ زیادہ تر انگریزی ادب ہی پڑھاتے رہے ہیں۔ وہ اردو کے ادیبوں کے بارے میں لکھنے کے دوران کہیں کہیں ان کا تقابل انگریزی ادیبوں اور شاعروں سے کر جاتے ہیں۔ ویسے تو یہ سرسری سے ریمارک ہوتے ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ ان کا تقابل درست نہ ہو۔ کلیم الدین احمد نے ان کی اس قسم کی رایوں کی غلطی پر کافی سخت تنقید کی ہے۔

مجنوں کے تنقیدی مضامین کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں وہ اعلیٰ درجے کی تنقید کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ بعد میں ان کے یہاں اشتراکیت کے سلسلے میں میانہ روی آگئی تھی۔ دراصل وہ اشتراکی اصولوں کا اطلاق کرتے وقت ہماری معاشرتی اور تہذیبی قدروں کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔

نصراللہ خاں

گورکھپور بھی عجیب خطہ ہے۔ یہاں جو بھی پیدا ہوا باون گز کا۔ مجنوں صاحب کے والد گرامی دیوانہ گورکھپوری کا قد وقامت تو اس سے دو چار انگل نکلتا ہوا تھا۔ ان میں صرف دو باون گزوں کا نام ہم نے سنا ہے۔ ایک تو فراق ہیں اور دوسرے مجنوں۔ فراق ہندوستان میں رہ گئے۔ مجنوں پاکستان چلے آئے۔ اور یوں گورکھپوریوں کی تقسیم عمل میں آئی۔

اگر مجنوں صاحب کے ادبی کارناموں کو پھیلا کر ان کے سن وسال سے ناپا جائے تو مجنوں صاحب اسم با مسمّیٰ ثابت ہو گے۔

تنقید وفلسفے کے شعبے میں مجنوں صاحب نے چودہ کتابیں لکھی ہیں۔ افسانے کے مجموعوں اور افسانوں کا شمار ہی نہیں۔ انگریزی زبان کے مضامین بھی جو انگریزی زبان کے رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں، ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے۔ اگر ان سب کو پھیلا دیا جائے تو گورکھپور سے کراچی کے راستے پر قدم رکھنے کو جگہ نہ ملے۔ مجنوں گورکھپوری کا ادبی سایہ پانچ نسلوں پر محیط ہے۔ اور ہماری دعا ہے کہ مجنوں صاحب ایک دو نسلیں اور دیکھتے جائیں۔

پروفیسر سراج احمد علوی

میں نے ابوالکلام آزاد مرحوم اور مرحوم نیاز کے بعد اگر کسی کو برجستہ اور برمحل شعر کہتے اور اپنی تالیفات اور تصنیفات میں جڑتے دیکھا تو صرف اور صرف مجنوں کو۔ اس کا ثبوت ان کی کتابوں اور بالخصوص ان کے افسانوں سے مل سکتا ہے۔ فارسی میں خسرو، عرفی، نظیری، بیدل اور غالب' اردو میں میر، قائم اور آسی غازی پوری وغیرہ کے اشعار مضامین میں اس سلیقے سے پیش کرتے ہیں کہ ان کے مطالب واضح ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان کی ژرف نگاہی نہیں بلکہ ان کے حسن انتخاب کی بھی داد دینا پڑے گی۔

کتابوں کے ذوق کا ایک واقعہ انھوں نے خود ایک بار سنایا کہ ان کے والد محترم جناب محمد فاروق دیوانہ ایم۔ اے۔ نے ایک اچھی خاصی رقم ان کو دی کہ مالگزاری جمع کرا آئیں۔ گھر سے تو مجنوں صاحب اسی مقصد سے نکلے۔ لیکن واپس آئے تو کتابوں سے لدے پھندے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ راستے میں

کتابوں کی دکان پڑی اور پوری رقم کتابوں کی خرید میں ختم ہوگئی۔ اور مالگزاری اپنی جگہ واجب الادا رہ گئی۔

انھیں اپنے مطالعہ کے انہماک سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ وہ کسی کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے۔ پھر یہ کہ ان کی وسیع النظری اور وقت بینی آسانی سے کسی کی ہاں میں ہاں ملانا گوارا نہیں کرتی تھی۔ وہ بڑے دم خم کے ساتھ اپنی انفرادیت قائم رکھتے تھے۔ آخر وقت تک ان کی یہ ادائے خاص باقی رہی۔

پروفیسر اسلم فرخی

ہوتا عموماً یہ ہے کہ بڑے فنکار اور لکھنے والے عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر مطالعہ سے بے نیاز ہوجاتے ہیں اور صرف اپنی کہتے ہیں، دوسروں کی نہیں سنتے۔ مجنوں صاحب کا کمال یہ تھا کہ وہ مسلسل مطالعہ کرت رہتے تھے۔ تمام جدید میلانات و رجحانات سے پوری طرح واقف تھے اور نئے ذہن کی تازگی کے قائل تھے۔ ایک دن کہنے لگے: ''ہم لوگ اب پرانے ہوگئے ہیں، نئے ذہن کی رہنمائی کے منتظر ہیں۔'' نوجوانوں کے خیالات کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کی بات بڑی توجہ سے سنتے تھے۔

پروفیسر انجم اعظمی

مجنوں صاحب صاحبان بصیرت میں سے ہیں۔ آپ مجنوں صاحب کی کتابیں پڑھئے، ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر غور کیجئے، ان کی تحریروں کو اپنے وجود میں بسائیے اور دیکھئے کہ زندگی کا سفر اقدار کی چھاؤں میں اس طرح گزر رہا ہے کہ تلخ حقائق کے سامنے تھک ہار کر بیٹھ جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اور وہ بھرپور امنگ جس کا دوسرا نام روشنی حیات ہے۔ آپ کے ہمارے اور سب کے دلوں میں زندہ ہے جو اسی (۸۰) سال کی عمر میں بھی مجنوں صاحب کی زندگی میں جاری و ساری ہے۔

مجنوں صاحب کے علم و فن کو دوام حاصل ہو چکا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اعتراف کی یہ روشنی جہاں تک ممکن ہو پھیلتی جائے۔

مجنوں گورکھ پوری کی تصانیف

تنقید و فلسفہ

شوپنہاور

تاریخ جمالیات

افسانہ

ادب اور زندگی

اقبال

تنقیدی حاشیے

نقوش وافکار

نکات مجنوں

شعروغزل

دوش وفردا

پردیسی کے خطوط۔۱

پردیسی کے خطوط۔۲

غزل سرا

غالب: شخص اور شاعر

افسانہ

خواب وخیال

کفن پوش

نقش ناہید

مجنوں کے افسانے

سوگوارِ شباب

گردش

صیدزبوں

سرنوشت

سراب

زیدی کا حشر

تراجم:۔

سلومی (آسکر وائلڈ)

آغاز ہستی (برنارڈ شا)

ابوالخمر (طالستائی)

قابیل (بائرن)

مریم مجدلانی (مارس ماہترلنک)

سنگھاسن بتیسی (ہندی کی لوک کہانیاں)

کنگ لیئر (شکسپیر)

شمسون مبارز (ملٹن)

......☆......

محشرِ خیال

افتخار عارف

مرسلہ شمارہ ''پیش رفت انٹرنیشنل'' (۱۲۔۱۱) موصول ہوا۔آپ کی عنایت اور نوازش خاص کہ آپ یاد رکھتے ہیں، توجہ فرماتے ہیں اور رسالہ بھیجنے کی زحمت کرتے ہیں۔انشاء اللہ تعالیٰ ستفادے کی صورتیں نکلیں گی۔ میں اپنی اور اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے آپ کا احسان مند ہوں۔آپ ہمیں سلوک اور احسان رکھنے والوں میں پائیں گے۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

(صدر نشین، اکادمی ادبیات پاکستان، ایچ۔۸/۱۔پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد۔)

ڈاکٹر انور سدید

''پیش رفت کا شمارہ ۱۲۔۱۱اور آپ کی کتابوں کا قیمتی تحفہ موصول ہوا۔میں اس کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔آپ کی کتاب ''جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک'' مجھے برادرم سجاد نقوی مدیر معاون ''اوراق'' نے مطالعہ کے لئے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ اس پر ''نوائے وقت'' کے سنڈے ایڈیشن میں تبصرہ لکھ دوں۔یہ تبصرہ ۱۹ر اپریل ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں چھپا ہے۔اس کی ایک فوٹو کاپی اس خط کے ساتھ ارسال خدمت ہے۔

''پیش رفت انٹرنیشنل'' اگرچہ کتابی سلسلہ ہے لیکن اس میں ایک ادبی رسالے کے تمام محاسن موجود ہیں۔تاہم اس کی بے قاعدہ اشاعت آپ کے اس نصب العین کی تکمیل میں ضرور حارج ہوگی جو اس کتابی میں آپ کے پیش نظر ہے۔ادبی انعامات کا سلسلہ اچھا ہے۔لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ اس وقت ملک کا ہر ادیب ''باون گزا'' ہے اور اپنے آپ کو بڑے سے بڑے انعام کا واحد حقدار سمجھتا ہے۔چنانچہ جب بھی انعامات کا اعلان ہوتا ہے تو حق تلفی کا وسیع تر تاثر پھیل جاتا ہے اور انعامات تقسیم کرنے والوں کی نیکی برباد ہو جاتی ہے۔میرا مشورہ ہے کہ جو اخراجات انعام دینے پر اٹھتے ہیں وہ ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کی باقاعدہ اشاعت پر خرچ کیے جائیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے پچھلے دنوں ایک نئی ادبی تحریک کی ضرورت پر زور دیا لیکن ادبی ماہنامے ہی نہیں ہوں گے تو تحریک کیسے برپا ہوگی؟......'فنون'، 'نقوش'،

اوراق، 'سیپ' جیسے اعلیٰ ادبی پرچے لمبے عرصے کے بعد شائع ہوتے ہیں اور ادب کی ''انتھولوجیز'' (Anthologies) میں شمار ہوتے ہیں۔ان رسائل سے آج تک کوئی تحریک نہیں ابھری۔تحریک کے لئے 'ساقی'، 'ادبی دنیا'، 'ادب لطیف' اور 'نیرنگ خیال' جیسے رسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔میری درخواست ہے کہ ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کو بھی اس جہت میں ہی لے جانے کی کوشش کی جائے۔

میں اپنی نئی کتاب ''اویہاں رفتہ'' پیش خدمت کرتا ہوں اگر ممکن ہو تو ''پیش رفت انٹرنیشنل'' میں تبصرہ کر دیجئے' مجھے اس سے رہنمائی ملے گی۔

آپ سے ملاقات کا باعث آپ کی کتاب پر تبصرہ ہے۔اور اب میں حاضر خدمت ہوں۔سلام محبت قبول کیجئے۔خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

(۲ے ا۔ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن۔لاہور)۔

اقبال سحر انبالوی

ایک طویل عرصے کے بعد رابطہ کر رہا ہوں۔آپ جانتے ہیں بڑھاپا بیماریوں کا مجموعہ ہے۔کوئی نہ کوئی تکلیف بوڑھے آدمی کو گھیرے رہتی ہے۔یہی حال اپنا بھی ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ کا اتنا شکر ہے کہ چل پھر رہا ہوں۔ماہنامہ ''رشحات'' کی اشاعت دوبارہ شروع کی ہے۔امید ہے کہ یہ سلسلہ اب جاری رہے گا۔بشرطیکہ اللہ رب العزت کی طرف سے مہلت ملتی رہی۔آپ سے دعاؤں کا طالب ہوں۔(خدا آپ کو حیات و تندرستی کی دولت سے مالا مال رکھے۔ش۔ا۔ش)

''رشحات'' کا تازہ شمارہ حاضر ہے۔نیز ایک غزل سہ ماہی ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کے لئے منسلک ہے۔گر قبول افتد زہے عزو شرف۔کسی قابل ہو تو ''پیش رفت انٹرنیشنل'' میں کہیں ٹانک دیجئے گا۔شکریہ۔

(۴۱۷۔بی۔تاج پورہ ہاؤسنگ اسکیم۔لاہور۔۵۴۸۷۰)

شارق بلیاوی

آپ کا سہ ماہی ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔اتنی محنت اور لگن سے اتنا خوبصورت جریدہ نکالنے پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔آپ کا رسالہ بہت معیاری ہے۔جس میں شامل تمام مضامین بہت اچھے اور سیر حاصل ہیں۔خدا آپ کو صحت و زندگی دے تا کہ آپ اردو ادب کی اسی طرح خدمت کرتے رہیں، آمین۔

آغا نور محمد پٹھان، ریزیڈنٹ ڈائرکٹر، اکادمی ادبیات پاکستان۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ حسب معمول سہ ماہی ''پیش رفت انٹرنیشنل'' ماہ دسمبر تا اپریل ۲۰۰۶ء کی ایک کاپی بطور اعزازی ملی۔ آپ کا رسالہ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ جس کے لئے میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔

آپ جس محنت اور لگن سے مکمل علمی و ادبی مجلّہ کو باقاعدگی سے جاری رکھے ہوئے ہیں اس کس لئے آپ مبارکبادی کے مستحق ہیں۔ اس پرچے میں شامل بہترین ادبی و علمی مضامین زیر مطالعہ رہے ہیں۔ اور دفتر میں آنے والے معزز مہمانوں اور دانشوروں کو بھی پرچہ مطالعہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ اس شمارے میں مندرجہ ذیل تخلیقات بہت اچھی لگیں۔ ۱۔ انعام یافتگان کے بارے میں اہل قلم کے خیالات ۲۔ فرار (افسانہ) ۳۔ پہچان (افسانہ)۔

براہ کرم ٹائٹل پر خصوصی توجہ دیجئے۔ زیر نظر شمارے کی طرح ہر شمارہ خصوصی نمبر ہونا چاہئے۔ مثال کے طور پر افسانہ سال ۲۰۰۵ء نمبر، شاعری ۲۰۰۵ نمبر، سال ۲۰۰۵ میں شائع شدہ کتابوں پر تبصرہ و تعارف انگریزی، اردو اور سندھی میں۔ اہل قلم ڈائرکٹری نمبر۔ اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہیں۔ (۸۰۔ اے، بلاک ۲، پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی۔ خالد بن ولید روڈ کراچی۔)

سجاد مرزا۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کا شمارہ ۱۱۔۱۲ مل گیا تھا۔ اس کے لئے آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔

کتابوں پر انعامات و اسناد دینے کا سلسلہ خوب ہے۔ اسے جاری رہنا چاہئے۔ کبھی کبھار خط لکھ دیا کریں کہ آدھی ملاقات میں تسلسل رہتا ہے۔ احباب کی خدمت میں سلام۔ (گوبند گڑھ، گوجرانوالہ۔)

محمد حامد سراج

آپ پر رب کریم کی رحمت بے کنار۔ محبتوں کے سلسلے دائم رہیں۔

''پیش رفت انٹرنیشنل کے پلیٹ فارم سے ناچیز کو جو عزت، توقیر، ایوارڈ، سند ملی۔ یعنی ''رشید احمد صدیقی انعام'' میری کتاب ''میا'' پر...... الفاظ کم ہیں عنایت زیادہ۔ معلوم نہیں شہناز شور و صاحبہ میرا انعام اور سند

لیئے ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کی تقریب تقسیم انعامات و اسناد میں کیوں نہیں پہنچ سکیں، ان کو ایک مختصر سا مضمون بھیجا تھا جو انمی تقریب میں پڑھا جانا تھا۔ اس کی کاپی آپ کو بھجوا رہا ہوں تا کہ ''پیش رفت انٹر نیشنل'' کے آنے والے شمارے میں شامل ہو سکے۔ بھائی یہاں انٹرنیٹ مردہ ہو گئے ہیں۔ POL دیوالیہ ہوگئی ہے۔ اور Pak net میں کوئی تکنیکی خرابی ہے۔ پورا ضلع میانوالی دنیا سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ دیکھئے یہ سلسلے کب بحال ہوں۔ سخت کوفت اور پریشانی کا سامنا ہے۔ امید ہے آپ ایوارڈ اور سند ناچیز کو بذریعہ ڈاک بھجوا دیں گے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی۔

فیصل آباد سے قاسم یعقوب نے ادبی جریدہ ''نقاط'' کا اجرا کیا ہے۔ آپ کے ذوق مطالعہ کے لئے بھجوا رہا ہوں۔ آپ تکلیف کیجئے اور قاسم یعقوب کو نہ صرف رسید بھجوایئے بلکہ حوصلہ افزائی کیجئے تا کہ نوجوانوں میں آگے بڑھنے کی لگن کو مہمیز ملے۔ ہو سکے تو ''پیش رفت انٹرنیشنل'' بھی بھجوا دیجئے۔

آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

(ڈاکخانہ چشمہ بیراج' میانوالی' پوسٹ کوڈ ۴۲۰۳۰ پاکستان)

حسیر نوری

اللہ رب العزت آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ رکھے۔ یقیناً رات دن کا چین قربان کیا ہے آپ نے تب کہیں جا کر آپ آج اس مقام پر پہنچے ہیں۔ آپ کو پروفیسر اظہر قادری مرحوم کی رفاقت بھی میسر رہی ہے۔ مرحوم اظہر قادری کا احسان حاصل کرنے والے بھی اب انھیں یاد نہیں کرتے ہیں۔ آپ ہی کے توسط سے ایک دفعہ ان سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی۔ میں ان کی عظمت، شرافت اور اردو زبان و ادب سے ان کی بے لوث محبت کو سلام عقیدت پیش کرتا ہوں۔ مرحوم بہت ہی درویش' غیر جانبدار، حق گو کے علاوہ وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدہ بھی رکھتے تھے۔ وہ تمام تر خصوصیات آپ میں موجود ہیں۔ اس لئے مجھے آپ پر فخر ہے۔ اللہ آپ کے حوصلوں کو بلند رکھے۔ اور آپ ''پیش رفت انٹرنیشنل'' شائع کرتے رہیں اور دیگر ادبی کام بھی جاری رکھیں۔

(بی۔۱۱۱، مصطفےٰ آباد، ملیر سٹی۔ کراچی۔ ۷۵۰۵۰)

فراغ روہوی

''پیش رفت انٹرنیشنل'' کا شمارہ نمبر ۱۲۔۱۱ اختر بارک پوری صاحب کے پتے پر موصول ہوا۔ مذکورہ شمارے کے نمائندگان کی فہرست میں خاکسار کے نام کو شامل فرما کر آپ نے بے پناہ محبت کا مظاہرہ کیا ہے۔ دوم

غزل اور عالمی حمد نمبر کے اشتہار کو بھی شائع کر کے فراغ نوازی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔اتنی ساری محبتوں کے لئے میں بے حد ممنون ہوں۔خدا کرے محبتوں کا یہ سلسلہ دونوں طرف سے دراز ہو۔

عادل حیات صاحب میرے، بہت پرانے دوست ہیں۔اکثر دہلی سے کلکتے آیا کرتے ہیں۔خوب خوب لکھ رہے ہیں۔نظمیں بھی اور غزلیں بھی۔تازہ شمارے (۱۲-۱۱) میں ان کی بھی غزل شامل اشاعت ہے۔تاہم اعزازی کاپی سے محروم ہیں۔مجھ سے ان کی محرومی دیکھی نہیں گئی۔لہذا اپنی کاپی انھیں دے دی۔پچھلے شمارے پر بھی انھوں نے اپنا حق جمالیا تھا۔ممکن ہو تو شمارہ ۱۲-۱۱ کی ایک اور جلد براہ راست میرے پتے پر بھجوا دیں۔' رابطہ و کتابت میرے ہی پتے پر کیا کریں۔کرم ہوگا۔

''دستخط'' کے عالمی حمد نمبر کی تیاریوں میں لگا ہوا ہوں یہ نمبر آئندہ سال کے جولائی میں آپ تک پہنچ گا۔(انشاء اللہ)۔خدا کرے مزاج شگفتہ ہو۔[۲۷۔مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کولوٹولہ) کولکاتا ۷۳۰۰۰]

ڈاکٹر عمران مشتاق' ۳۔بروکیٹ پلیس' کوستان' رگبی' سی وی ۲۲' ۷ ایکس جی' برطانیہ:

''پیش رفت انٹرنیشنل'' کا تازہ شمارہ ملا۔فون پر آپ کو ملنے کی رسید بھی دے دی تھی۔اب آہستہ آہستہ قراءت مکمل ہوئی ہے۔''ہمارے ادب کے بنیادی مسائل'' آپ سہولت سے اجاگر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔اداریہ ہمیشہ ہی تاثر انگیز اور ادب سے متعلق نئے اور جاری مسائل کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔اس مرتبہ جو بات سب زیادہ اہمیت اختیار کرتی ہے وہ ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کے ادبی انعامات کی تقسیم سے متعلق ہے' گویا کہ یہ صرف ''اعلان'' ہی نہ تھا۔اپنے محدود وسائل کے باوجود آپ کی یہ غیر معمولی ''ادبی کوشش'' یقیناً لائق تحسین ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ادبی بخیلی کے سوا کچھ نہیں۔انعام یافتگان کے تعارف اور مشاہیر کے تاثرات ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کو اعتبار بخشتے ہیں۔

افسانوں کا حصہ خاصہ وقیع ہے۔قیصر سلیم کا ''فرار'' اور فرید شہزاد کا ''شہر تمنا'' زیادہ متاثر کرتے ہیں۔''جمال وکمال'' یعنی محفل سخن میں قوس قزح کے رنگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون ''ادب اور خبر'' صحافت کو خالص ادب سے جدا کرنے کی احسن کاوش ہے۔(ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہیں محترم وزیر آغا صاحب لفظ ''کاوش'' پر ناراض ہی نہ ہو جائیں) ویسے ان جیسے مخلص' ادب دوست فی زمانہ مشکل ہی سے نظر آئیں گے۔''پیش رفت انٹرنیشنل'' کا تازہ شمارہ' گزشتہ ایشوز کی طرح لائق مطالعہ ہے۔

شفیق احمد شفیق کی چند تصنیفات

ادراک: (تنقیدی مقالات) مطبوعہ ۱۹۹۱ء

پس لفظ آئینہ: (شعری مجموعہ) مطبوعہ ۱۹۹۸ء

جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک: فکریات و نظریات

(نظری انتقادیات) مطبوعہ ۲۰۰۵ء

فکروفن کے محرکات: (تنقیدی مضامین) مطبوعہ ۲۰۰۱ء

مصنف پروفیسر اظہر قادری / ترتیب و تدوین: شفیق احمد شفیق

زیرِ طبع کتابیں

نقد و تجزیہ (انتقادیات)

(تقریباً تمام اصناف ادب سے تعلق رکھنے والی کتابوں کا الگ الگ تجزیاتی مطالعہ)

Litterateurs

(اردو اور انگریزی کے معروف ادیبوں اور شاعروں پر انگریزی میں تجزیاتی مقالات کا مجموعہ)

دشتِ بے اماں (شعری مجموعہ)

My views on reviews

(انگریزی میں کتابوں پر تبصرے و تجزیے)

ناقدین (تنقید نگاروں پر مضامین)

اردو افسانے کل اور آج (تنقید و تحقیق)

سنگ اور رنگ (شعری مجموعہ)

ستون (چند اساتذہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ)

اردو ادب مشرقی پاکستان میں (تنقید و تحقیق)

زیرِ اہتمام: ''پیش رفت انٹرنیشنل''

ناشر: حلقۂ آہنگِ نو، ڈی۔ٹی۔۷۸، بلاک ۱۸، سمن آباد، فیڈرل بی ایریا، کراچی

عقیل احمد فضا اعظمی کی شعری تصنیف

آوازِ شکستگی۔ صدا آتی ہے تہذیبوں کے مدفن سے (مثنوی)

صفحات: ۲۳۰ قیمت: ۲۲۵ روپے

عذابِ ہمسائیگی (مثنوی) (انگریزی ترجمے کے ساتھ)

صفحات: ۲۰۱ قیمت: ۱۷۵ روپے

تری شباہت کے دائرے میں (مجموعۂ شاعری)

صفحات: ۲۲۸ قیمت: ۱۷۵ روپے

مرثیہ مرگِ ضمیر (مثنوی)

صفحات: ۲۶۹ قیمت: ۲۵۰ روپے

کرسی نامۂ پاکستان (مثنوی)

صفحات: ۷۳ قیمت: ۷۵ روپے

جو دل پہ گزری ہے (مجموعۂ شاعری)

صفحات: ۲۶۹ قیمت: ۲۵۰ روپے

مرثیہ مرگِ ضمیر کا انگریزی ترجمہ

Death of conscience:an elegy

ترجمہ: فرزانہ احمد

خاک میں کیا صورتیں (مسدس)

صفحات: ۲۳۹ قیمت: ۲۵۰ روپے

رابطہ: نقش پبلیکیشنز، کوہِ نور الیکٹرانکس سنٹر، چوتھی منزل، کمرہ نمبر ۲۱۹

عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی، فون: ۲۷۵۲۷۸۲

مظفر حسین نوید تلاوت کلام ربانی کے بعد توصیف محبوب ربانی پیش کر رہے ہیں۔

ممتاز افسانہ نویس و ڈرامہ نگار عاصم صدیقی تقریب تقسیم لوح اعزاز و اسناد کی نظامت کرتے ہوئے۔

مجلس صدور کے معزز اراکین (دائیں سے بائیں) اکادمی ادبیات پاکستان کے ریجنل ڈائریکٹر آغا نور محمد پٹھان، ڈاکٹر پروفیسر حنیف فوق، ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، ڈاکٹر پروفیسر فرمان فتح پوری، ''پیش رفت انٹرنیشنل'' کے مدیر اعلیٰ شفیق احمد شفیق اور عاصم صدیقی۔

مجلس صدور کے معزز اراکین (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، پروفیسر حنیف فوق، آغا نور محمد پٹھان ریجنل ڈائریکٹر اکادمی ادبیات پاکستان "پیش رفت انٹرنیشنل" کی تقریب تقسیم اسناد و انعامات سے خطاب کررہے ہیں۔

ہر انعام یافتہ قلمکار کو انعام دینے سے پہلے ان کا تعارف بھی پیش کیا گیا۔ تعارف پیش کرنے والے (دائیں سے بائیں) حمیرہ راحت، پروین حیدر، فائزہ غزل، سلیمان صدیقی، حامد علی سید، احمد سعید فیض آبادی، ندا علی، رومانہ رومی اور زاہد رشید

اکادمی ادبیات پاکستان کے ریجنل ڈائرکٹر آغا نور محمد پٹھان اور حبیب احسن مدیر "خیال" نے شفیق احمد شفیق کی علمی و ادبی کارکردگی کے اعتراف میں انھیں لوح اعزازت دیے۔ یہ انعامات واعزازات "پیش رفت انٹرنیشنل" کے پروگرام میں شامل نہیں تھے۔ بلکہ ان دونوں حضرات نے ازراہ کرم اپنے اپنے طور پر پیش کیے۔ پہلی تصویر میں اکادمی ادبیات پاکستان کے ریجنل ڈائرکٹر آغا نور محمد پٹھان مدیر اعلیٰ "پیش رفت انٹرنیشنل" کو شیلڈ پیش کر رہے ہیں۔ دوسری تصویر میں حبیب احسن "مدیر خیال" لوح اعزاز عطا کر رہے ہیں۔

اختر سعیدی تشریف نہیں لائے ان کا انعام ندا علی پروفیسر پیرزادہ قاسم سے حاصل کر رہی ہیں

ڈاکٹر محمد صدیقی تشریف نہ لا سکے اس لئے اُن کا انعام اور سندِ فضیلت ندا علی ڈاکٹر حنیف فوق سے حاصل کر رہی ہیں

شہناز نور ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے اپنا انعام لوح اعزاز و سند اعتراف فضیلت حاصل کر رہی ہیں۔

محمد حامد سراج کا انعام حمیرہ راحت ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے وصول کر رہی ہیں

عشرت رومانی اپنا انعام لوح اعزاز و سند اعتراف فضیلت ڈاکٹر حنیف فوق سے لے رہے ہیں۔

جمال نقوی آغا نور محمد پٹھان سے لوح اعزاز اور سند فضیلت لے رہے ہیں۔

احمد زین الدین اکادمی ادبیات پاکستان کے ریجنل ڈائرکٹر آغا نور محمد پٹھان سے لوح اعزام و سند اعتراف دانش وصول کر رہے ہیں۔

سید نعمت اللہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے سند فضیلت ولوح اعزاز لے رہے ہیں۔

جمال پانی پتی مرحوم کا انعام پروفیسر شبنم صدیقی ڈاکٹر پیرزادہ قاسم سے لے رہے ہیں۔

کوئٹے میں اپنی ناگزیر سرکاری مصروفیت کے سبب آغا گل کراچی تشریف نہ لا سکے۔ ان کی جگہ فائزہ غزل کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم سے انعام لے رہی ہیں۔

ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی اپنا انعام سند اعتراف دانش اور لوح اعزاز ڈاکٹر حنیف فوق سے وصول کر رہے ہیں۔

قیصر سلیم ڈاکٹر پیرزادہ قاسم سے لوح اعزاز اور سند اعتراف دانش وصول کر رہے ہیں۔

پروفیسر افتخار اجمل شاہین اپنا انعام لوح اعزاز و سند اعتراف دانش ڈاکٹر پیرزادہ قاسم سے وصول کر رہے ہیں۔

پروفیسر نجم الہدیٰ اپنا انعام لوح اعزاز و سند اعتراف دانش ڈاکٹر پیرزادہ قاسم سے لے رہے ہیں۔

شفیق احمد شفیق امریکہ کی مہمان شاعرہ رشید عیاں کو
اپنی کتاب پیش کر رہے ہیں۔

بھارت کے مہمان شاعر اور سہ ماہی مژگاں
کلکتہ کے مدیر نوشاد مومن کو شفیق احمد شفیق
اپنا شعری مجموعہ پسِ لفظ آئینہ پیش کر رہے ہیں۔

پروفیسر آفاق صدیقی اپنا انعام لوح اعزاز اور سند
فضیلت ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے حاصل کر رہے ہیں

ناصر بغدادی کا انعام نسبت بلال دانش ڈاکٹر
فرمان فتح پوری سے لے رہے ہیں۔

ادیب سہیل اپنا انعام و سند آغا نور محمد پٹھان سے لے
رہے ہیں۔

محمد اسماعیل یوسف ڈاکٹر حنیف فوق سے لوح اعزاز و
سند اعتراف دانش وصول کر رہے ہیں۔

معروف افسانہ نگار شہناز پروین ''پیش رفت انٹر نیشنل'' اور اس کے مدیر کی ادبی و علمی کارکردگی کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کر رہی ہیں۔

طہیر بیدری کا انعام مظفر حسین آغا نور محمد پٹھان سے وصول کر رہے ہیں۔

تقریب کے سامعین: (دائیں طرف سے) امیر الدین، پروفیسر آفاق، فضا اعظمی، بیگم آفاق، بیگم جمال نقوی ان کی صاحبزادی (پچھلی صف میں) شارق بلیاوی، جمال نقوی اور پروفیسر شبنم صدیقی۔

''پیش رفت انٹر نیشنل'' کے ناشر روشن خیال نازش تقریب تقسیم انعامات واسناد کے اختتام پر مجلس صدور، انعام یافتگان، تعلیف پیش کرنے والوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کر رہے ہیں کہ انہوں نے شرکت فرما کر تقریب کو کامیاب بنایا۔

پہلی صف میں (دائیں سے بائیں) شہناز پروین، ندا علی، حمیرا راحت، رومانہ رومی، حامد علی سید، سلمان صدیقی، شبنم صدیقی، مشرق صدیقی، شہناز نور۔ پچھلی صف میں (دائیں سے بائیں) عاصم صدیقی، زاہد رشید، حنیف فوق، احمد سعید فیض آبادی، شفیق احمد، آفاق صدیقی، پیرزادہ قاسم، فرمان فتح پوری، مطیع الرحمٰن

"پیش رفت انٹرنیشنل" کی جانب سے ہر سال کسی سینئر ادیب کی مجموعی علمی و ادبی کاوشوں کے اعتراف میں ایک بڑا انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ ۲۰۰۲ء کا انعام فضا اعظمی کو ان کی مجموعی علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر دیا گیا ہے۔ وہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے سندِ اعتراف کمال و دانش اور لوحِ اعزاز فضیلت وصول کر رہے ہیں۔

"پیش رفت انٹرنیشنل" کے مدیر اعلیٰ شفیق احمد شفیق تقریب سے خطاب کر رہے ہیں۔